ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور
۲۹ / نومبر ۱۹۹۴ء

☆ کیا خلافت بھی کوئی بھولی بسری داستان ہے؟
☆ امریکی عزائم اور اقوامِ عالم کا اضطراب
☆ باغ بیرون موچی دروازہ کے بوڑھے درختوں نے حیرت سے دیکھا...

حدیث امروز

کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے !

قائد حزب اختلاف کے والد ماجد میاں محمد شریف کی گرفتاری اس ہفتے کی سب سے بڑی اور اہم ترین خبر ثابت ہوئی۔ پھر کون سا اخبار تھا جس میں اس پر کالم پہ کالم نہ لکھے گئے ہوں اور اداریوں شذروں کی بھرمار نہ ہوئی ہو۔ اس کا سیاسی پہلو' موقع و محل' میاں صاحب کی کاروباری حیثیت' نیک شہرت' پیرانہ سالی و علالت اور پھر چھاپہ مار کارروائی کے انداز میں ان پر ہاتھ ڈالتے وقت چھینا جھپٹی کا سا سماں جس میں ان کے زخمی ہو جانے تک کی روایات آئی ہیں' غرض کس زاویئے سے اس واقعہ پر روشنی ڈال کر اور حاشیہ آرائی کے ذریعے نتائج اخذ نہیں کئے گئے۔ اس سلسلے میں جو کچھ بھی کہا گیا' جزوی اختلاف کے باوجود اسے صائب مانے بغیر چارہ نہیں۔ میاں صاحب پر عائد کی جانے والی فرد جرم کی نوعیت کچھ بھی ہو' اسے حکومت اور اپوزیشن میں جاری خوفناک محاذ آرائی کا شاخسانہ ہی قرار دیا جائے گا۔ پارلیمنٹ کے اس مشترکہ اجلاس سے ایک دن قبل اس گرفتاری کو جس میں صدر مملکت کو اپنی ایک آئینی ذمہ داری پوری کرنی تھی' جلتی پر تیل ڈالنے کا نام بھی غلط نہیں دیا گیا۔ میاں شریف صاحب کی کاروباری حیثیت مسلمہ ہے اور اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملک کا کون سا چھوٹا بڑا کاروباری ہے جو کسی نہ کسی بے قاعدگی بلکہ ایسے کسی جرم میں ملوث نہیں جسے قانون کی نظر میں قابل گرفت گردانا جا سکتا ہے۔ میاں صاحب کی سخاوت' مذہبیت اور زندگی کے معمولات میں بے لچک نظم و ضبط پر بھی بڑی ہی معتبر شہادتیں منظر عام پر آئی ہیں۔ ان کی پیرانہ سالی شک و شبہ سے بالا ہے اور صحت کی نزاکت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو گا کہ دل کے مریض ہیں اور "بائی پاس" کروائے بیٹھے ہیں اور گرفتاری کے "آپریشن" کی جو تفصیلات حامی و مخالف اخبارات میں منظر عام پر آئی ہیں' ان میں غیر معمولی حرکات و سکنات کا یکساں ذکر ہے۔

غنیمت ہے کہ اس ڈرامے کا ڈراپ سین جلد ہو گیا اور اب یہ قصہ معمول کی قانونی کارروائی کی شکل اختیار کر کے کچہری تھانے میں طول کھینچے گا ورنہ یار لوگ تو جنگل کی آگ کی طرح پھیلنے والی اس افواہ کی تصدیق کے لئے مرے جا رہے تھے کہ میاں صاحب کا حراست میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا ہے تاکہ ملک میں آگ بھڑک اٹھے اور سب کچھ بھسم کر کے رکھ دے لیکن الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ نے حکمرانوں کو اپنی حماقتوں سے سبق سیکھنے کا ایک اور موقع عنایت فرما دیا' شاید ان کی کوئی "نیکی" کام آ گئی ہے۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔ میاں محمد شریف صاحب کے ساتھ جو معاملہ ہوا' اس پر اظہار ناپسندیدگی بلکہ اس کی مذمت تک میں ہماری آواز بھی زبان خلق کا ساتھ دیتی ہے اور وجہ صاف ظاہر ہے' ہم نے ان سب عوامل سے اتفاق کیا ہے جو اختصار کے ساتھ سطور بالا میں گنوا دیئے گئے ہیں لیکن اس واقعہ نے جن سوالات کو جنم دیا ہے ان کا جواب کون دے گا' کیا دے گا؟۔ پہلا سوال یہ ہے کہ "مرگِ انبوہ جشنے دارد" ایک محاورہ ضرور ہے لیکن کیا اس کا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ جو جرم تقریباً ہر شخص کر رہا ہو' وہ جواز حاصل کر لیتا ہے۔ رشوت لینا اور دینا ہر اعتبار سے ایک مذموم حرکت اور قانون کی نظر میں ایک قابلِ تعزیر جرم ہے اور اس ملک میں وہ لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جو اس جرم میں بلاواسطہ یا بلواسطہ ملوث نہیں۔ اس

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

قیمت: ۶ روپے

الھدیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مزین کردی گئی کافروں کے لئے دنیا کی زندگی' اور یہ مذاق اڑا رہے ہیں اہل ایمان کا'

(کہ دنیا کی زندگی کی دلچسپیوں اور رنگینیوں نے کفار کی نگاہوں کو اس درجہ خیرہ کر دیا ہے کہ وہ پورے طور پر اسی میں مگن اور منہمک ہو کر آخرت کو یکسر فراموش کر بیٹھے ہیں۔ گویا دنیا کی زندگی پر ان کی یہ فریفتگی ان کے قبول حق کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی ہے اور وہ اس سرمستی و سرشاری میں اہل ایمان کا مذاق اڑاتے اور ان پر پھبتیاں چست کرتے ہیں جن کا ہدف و مقصود آخرت کی زندگی ہے اور جنہوں نے اپنے جان و مال دین حق کے غلبہ اور اللہ کے کلمے کی سربلندی کے لئے وقف کر دیئے ہیں کہ ان لوگوں کی تو مت مار دی ہے ان کے دین نے' یہ اپنا نفع و نقصان بھول کر دین کے لئے سرگرم عمل ہیں' انہیں نہ اپنی کچھ ہوش ہے اور نہ اپنے بیوی بچوں کے مستقبل کا کچھ خیال' یہ لوگ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکے ہیں' وغیرہ!)

سورۃ البقرہ
(آیت ۲۱۲)

حالانکہ جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا وہ روز قیامت ان پر بالا ہوں گے۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب روزی عطا کرتا ہے ○

(یہ دنیا پرست لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ آخرت میں معاملہ برعکس ہو جائے گا۔ ان اہل تقویٰ کو جنہوں نے اللہ کی رضا اور اخروی کامیابی کے حصول کی خاطر دنیا کی زندگی کو تج دیا تھا' آخرت میں بہت بلند مقامات عطا کئے جائیں گے جبکہ ان کا مذاق اڑانے والے یہ کفار و منافقین دوزخ کے نچلے طبقات میں ہوں گے۔ اور اللہ اپنے وفاداروں کو وہ کچھ انعامات عطا فرمائے گا کہ جن کا شمار کرنا ناممکن ہو گا!)

ترجمانی : حافظ عاکف سعید

جوامع الکلم

اگر آدمؑ کے بیٹے کے پاس سونے سے بھری ایک وادی ہو تو وہ چاہے گا کہ اسے ایسی دو وادیاں مل جائیں۔ اس کے منہ کو قبر کی مٹی کے سوا اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔ اور اللہ اسی شخص کی توبہ قبول فرماتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے!

(کہ حرص و طمع کی کہیں کوئی انتہا نہیں! مال و دولت کی فراوانی حرص و ہوا کی تشنگی کو آسودگی عطا نہیں کرتی آتش شوق کو مزید بھڑکانے کا باعث بنتی ہے۔ کسی کے پاس سیم و زر کے اتنے انبار ہوں کہ ایک وسیع و عریض وادی کا دامن بھی انہیں سمیٹنے سے قاصر نظر آتا ہو تب بھی وہ ہرگز اس پر قناعت نہیں کرے گا بلکہ هَلْ مِن مَّزِيد کی ہڑک اسے بے چین رکھے گی اور اس کی شدید تمنا ہو گی کہ اتنا ہی سیم و زر مزید اسے حاصل ہو جائے۔ حضرت بیدلؔ نے صحیح فرمایا تھا کہ ۔" حرص قانع نیست بیدلؔ ورنہ در کارِ حیات۔ اکثر در کار داریم اکثرش در کار نیست!" اور از روئے فرمان نبویؐ اس حرص کی آگ کو صرف قبر کی مٹی ہی بجھا سکتی ہے' ورنہ وہ دنیادار لوگ بھی کہ جو اپنی عمر کی آخری سرحد تک پہنچ گئے ہوں بلکہ یوں کہئے کہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہوں' حرص و طمع سے رستگاری حاصل نہیں کر پاتے' قبر کی جانب بڑھتا ہوا ان کا ہر قدم ان کے حرص کی آگ میں شدت کے اضافہ کا باعث بنتا دکھائی دیتا ہے۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح رہنی چاہئے کہ اللہ کا یہ دستور نہیں ہے کہ وہ کسی کو زبردستی راہ ہدایت پر لے آئے' وہ اپنی عنایت و شفقت کے ساتھ اسی بندے کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو خلوص و اخلاص کے ساتھ اس کی بارگاہ میں اس کیفیت کے ساتھ رجوع کرے کہ اس کے دامن رحمت کے سوا کوئی اور پناہ گاہ اسے دکھائی نہ دیتی ہو!) (صحیح بخاری و صحیح مسلم بروایت عبداللہ بن عباسؓ)

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور

جلد ۳ شمارہ ۴۶

۲۹/ نومبر ۱۹۹۴ء

22

مدیر
اقتدار احمد

معاون مدیر
حافظ عاکف سعید

یکے از مطبوعات
تحریکِ خلافت پاکستان
۴ اے مزنگ روڈ۔ لاہور

مقامِ اشاعت
۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: ۸۵۶۰۰۳

پبلشر: اقتدار احمد طابع: رشید احمد چودھری
مطبع مکتبہ جدید پریس ریلوے روڈ لاہور

قیمت فی پرچہ: -/۶ روپے
سالانہ زرِ تعاون (اندرون پاکستان) -/۱۲۵ روپے

زرِ تعاون برائے بیرونِ پاکستان

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت	۱۲ امریکی ڈالر
مسقط، عمان، بنگلہ دیش	" " [illegible]
افریقہ، ایشیا، یورپ	۱۶ " "
شمالی امریکہ، آسٹریلیا	[illegible] " "

ہماری خارجہ پالیسی ؟

یادش بخیر، مشرقی وضعداری کا ایک انداز یہ بھی تھا کہ گھر میں دانے نہ ہوں تب بھی اماں بھنانے کے لئے نکل کھڑی ہوتی تھیں کہ بھرم تو رہے۔ خود قرآن مجید میں غیرتِ فقر کا مظہر اس رویے کو قرار دیا گیا ہے کہ دستِ سوال اشارتاً بھی دراز نہ کیا جائے، ہاں دیکھنے والے اپنی مومنانہ بصیرت سے پہچان کر کسی ضرورت مند کو عجز و انکسار کے ساتھ اپنا تعاون پیش کریں تو اسے قبول کر لینے میں قباحت نہیں۔ "تعرفہم بسیمہم لا یسئلون الناس الحافا"۔ (البقرہ : ۲۷۳) اور "ویوتون الزکٰوۃ وھم راکعون"۔ (المائدہ : ۵۵)۔ ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں پر یہ اصول صادق آتا ہو یا نہیں، مسلمانوں کو خودشناسی کا وقار خداشناسی کے واحد ذریعے سے حاصل ہوا کرتا ہے۔ "ولا تکونوا کالذین نسو اللہ فانسٰھم انفسھم"۔ (الحشر: ۱۹)۔

اس تناظر میں جائزہ لیا جائے تو ہماری "دکھری ٹائپ کی" مفلسی نے تو جس میں پاکستان کی غربت ضرب المثل ہے اور اہل پاکستان کے اللّے تللّے حیرت انگیز، ہمیں بھک منگوں کی قوم قرار دلوا ہی دیا ہے، ملک کی خارجہ پالیسی بھی غریب کی جورو بن کر رہ گئی ہے جو سب کی بھابی ہوتی ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ خارجہ پالیسی نامی کسی شے کا وجود یہاں پایا ہی نہیں جاتا۔ اس سے ہم فارغ خطی لے بیٹھے یا ہمارے ہاں یہ جنس کبھی پائی ہی نہیں جاتی تھی۔ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں!۔ وسیع تر عالمی برادری میں اور خود اپنے بھائیوں یعنی مسلم ممالک میں ہماری عزت کا دھیلا ہو چکا ہے تو اس لئے کہ ہم نے اپنی وہ خودی بیچ کھائی جس کا جاندار فلسفہ حکیم الامت علامہ اقبالؔ نے سورۃ الحشر کی محولہ بالا آیت سے ہی اخذ کیا تھا۔

مسئلۂ کشمیر پر ہماری اس قرارداد کا جو حشر ہوا جسے پیش کرنے والے وفد کی سربراہی قائد حزب اختلاف کو ان کے اعزاز و اکرام کے طور پر پیش کی گئی تھی، وہ عبرتناک ہے۔ گُل یہ کِھلا ہے کہ وہ غنچہ بن کھلے ہی مرجھا گیا۔ قبل ازیں جنیوا میں حقوقِ انسانی کے حوالے سے اس سلسلے میں جو قرارداد بڑے بلند بانگ دعاوی کے ساتھ مرتب ہوئی، بے موت مر گئی تھی۔

ان دونوں سانحوں کا سبب بننے والوں میں ہمارے قریب ترین مسلم ممالک کے علاوہ ایسی طاقتوں کا ذکر بھی آیا جن پہ ہمارا تکیہ تھا اور تاحال ہے۔ پچھلے دنوں کشمیر کے مسئلے پر مسلم ممالک کے وزرائے خارجہ کی ایک کانفرنس بڑی دھوم دھام سے اسلام آباد میں منعقد کر کے سماں باندھ دیا گیا تھا جو فی الحقیقت کروڑہا روپے کی اس رقم کی رونمائی تھی جو کھلے ہاتھوں خرچ کی گئی۔ ہمارا ماتھا تو یہی دیکھ کر ٹھنکا تھا کہ کانفرنس میں تشریف لانے والے وزرائے خارجہ خال خال تھے، اکثر مسلم ممالک کی نمائندگی امورِ خارجہ میں دوسرے درجے کے افسران نے کی۔ وزیرۂ عظمیٰ بے نظیر بھٹو کا "ایمان افروز" افتتاحی خطاب اور بوسنیا ہرزیگوینا کے مہمان وزیرِ اعظم جناب حارث سلاجیک کی مجاہدانہ گفتگو اس کانفرنس کا حاصل تھی ورنہ کشمیر کے لئے تو سارا کیا دھرا اب سامنے آ ہی گیا ہے اور مسلم ممالک کی "گرمجوشی" بھی ہم نے دیکھ لی۔

ہمارا مربی امریکہ بہادر سوویت یونین کے سقوط اور سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سے ہمارے ساتھ "کیرٹ اور سٹک" کا کھیل جاری رکھے ہوئے تھا لیکن اب لگتا ہے کہ کیرٹ (گاجر) تو اس نے جیب میں ڈال لی اور ہاتھ میں صرف سٹک (چھڑی) پکڑ رکھی ہے۔ امریکی ایوان نمائندگان اور سینٹ دونوں میں اپوزیشن کی اکثریت ہو جانے کے بعد اب صدر کلنٹن کی خوئے بد کو بہانۂ بسیار کی اضافی سہولت بھی حاصل ہو گئی ہے۔ جکارتہ کانفرنس میں دنیا کے ایک بہت بڑے خطے کی اقتصادی حکمت عملی کا نقشہ سن ۲۰۲۰ء تک کے لئے بنانے کی غرض سے جو سنجوگ ہوا، اس میں صدر امریکہ نے چینی راہنما سے پہلا سوال ہی یہ کیا تھا کہ آپ نے پاکستان کو دور مار میزائلوں کے سلسلے میں اب تک کیا کیا سہولتیں بہم پہنچائی ہیں اور آئندہ کے عزائم کیا ہیں۔ ظاہر ہے کہ چین ہمارے لئے اپنے مفادات کو کب تک قربان کرے گا اور آخر کیوں کرے گا؟۔ پاکستان پر امریکہ بادشاہ کی پسندیدہ خاتون کی حکمرانی ہے اور اس کے دربار میں ہماری سفارت کے فرائض بھی خوبصورت بانکی لہجے میں فر فر انگریزی بولنے والی ایک اور خاتون کے سپرد ہے۔ دونوں اسلامی بنیاد پرستی کے

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

لندن میں اذانِ خلافت

(قسط اوّل)

خلافت دراصل حاکمیت غیراللہ کی ضد ہے

اللہ کا حکم جیسے آسمان پر چلتا ہے ویسے ہی زمین پر بھی چلے

امیر تنظیم اسلامی پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد کا لندن کی بین الاقوامی مسلم خلافت کانفرنس سے خطاب

۷ / اگست ۹۴ء کو لندن کے وسیع و عریض وسیلے ایرینا میں "حزب التحریر" کے زیر اہتمام عظیم الشان بین الاقوامی مسلم خلافت کانفرنس کا حال ہمارے قارئین نے "ندائے خلافت" میں کئی حوالوں سے پڑھا ہے۔ ہمارا وعدہ تھا کہ اس میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے کلیدی خطاب کا اردو ترجمہ پیش کریں گے جسے لندن اور آس پاس کے یورپی ممالک کے علاوہ امریکی ذرائع ابلاغ نے بھی بہت اہمیت دی لیکن ابھی اس کا موقع نہ ملا تھا کہ ایک صاحب کی طرف سے یہ ترجمہ موصول ہو گیا جو آپ ان صفحات میں پڑھیں گے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ کسی اخباری استفسار کے جواب میں ان صاحب نے (جو اپنے نام کی اشاعت پسند نہیں فرماتے) ڈاکٹر صاحب کی اس انگریزی تقریر کا ویڈیو کیسٹ خریدا تھا اور اس کے ذریعے وہ پہلی بار ہمارے امیر محترم سے متعارف ہوئے۔ اس تقریر نے انہیں اس درجہ مسحور کیا کہ فوراً ترجمہ کرنے بیٹھ گئے اور پھر اس خواہش کے ساتھ ہمیں پہنچا کر دم لیا کہ ان کے ترجمے کی وسیع پیمانے پر اشاعت کا انتظام کیا جائے۔۔۔۔۔ مدیر

عزیز بھائیو، بہنو اور فرزندان اسلام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ بات یقیناً میرے لئے باعث مسرت اور اعزاز ہے کہ میں آج مغربی دنیا کے وسط میں مسلمانوں کے ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب کر رہا ہوں۔ میں اس جگہ کو مغربی دنیا کا وسط اس اعتبار سے کہہ رہا ہوں کہ براعظم یورپ برطانیہ کے جنوب اور مشرق میں واقع ہے اور دوسری جانب براعظم امریکہ اس کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اس طرح برطانیہ گویا ان دونوں براعظموں کے صدر نشین کی حیثیت سے متمکن ہے۔

وقت چونکہ بڑا محدود ہے۔ اس لئے میں اپنا خطاب براہ راست شروع کرتا ہوں۔ میں نے ابھی سورۂ نور کی آیت نمبر ۵۵ کی تلاوت کی ہے۔ سورۂ نور یا تو پانچویں ہجری کے آخر میں یا پھر چھٹی ہجری کے شروع میں نازل ہوئی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے تین وعدے کئے ہیں۔ اگرچہ یہ وعدے مشروط تھے کہ مسلمانوں کو دو شرائط پوری کرنی ہوں گی۔ پہلی یہ کہ اپنے اند ۔ اصل اور حقیقی ایمان پیدا کریں۔ محض زبانی دعویٰ نہ ہو' اور دوسرے یہ کہ اس ایمان کا عملی مظاہرہ بھی کرنا ہوگا' یعنی اعمال صالح۔ اگر آپ یہ دونوں شرائط پوری کرتے ہیں تو اللہ آپ سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ آپ کو (یعنی امت مسلمہ کو) زمین میں خلافت دے گا جیسا کہ اس نے آپ سے پہلی امتوں کو خلافت عطا کی۔ اور جیسے ہم نے حضرت داؤد علیہ السلام کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا تھا' اسی طرح ہم آپ کو بھی دنیا میں خلافت عطا کریں گے۔ اور دوسرا وعدہ مسلمانوں سے یہ تھا کہ ہم ان کے دین کو تمکن اور استحکام عطا فرمائیں گے کہ جسے ہم نے ان کے لئے پسند کر لیا ہے چنانچہ دین پر چلنا ان کے لئے آسان ہو جائے گا۔ اور تیسرا یہ کہ خوف اور عدم تحفظ کو ہم ان کے لئے امن اور تحفظ میں بدل دیں گے۔ یہ تینوں وعدے دراصل پہلے وعدے ہی کی فروعات ہیں کہ ہم انہیں لازماً خلافت عطا فرمائیں گے۔ اس لئے کہ جب دنیا میں خلافت کا نظام قائم ہو جائے گا پھر اس میں کسی زیادتی اور عدم تحفظ کا کوئی سوال ہی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا دین اعلیٰ ہوگا۔ اور جیسا کہ میں نے آپ سے کہا ہے کہ یہ تینوں وعدے یا تو پانچویں ہجری کے آخر میں اور یا چھٹی ہجری کے شروع میں مسلمانوں سے کئے گئے تھے۔ اور آپ اندازہ کریں کہ یہ تینوں وعدے کتنی جلدی پورے ہوئے۔ تاریخی طور پر یہ بات کر رہا ہوں۔ چھٹی ہجری میں صلح حدیبیہ عمل میں آئی۔ جسے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے فتح مبین قرار دیا تھا۔ اگلے ہی سال خیبر فتح ہوا۔ اور اس سے اگلے سال یعنی آٹھویں ہجری میں محمدؐ اور ان کے دس ہزار جانثار فاتحانہ شان سے مکہ میں داخل ہوئے۔ اور اس سے اگلے سال پورے خطہ عرب میں نظام خلافت عملی طور پر نافذ ہو چکا تھا اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ نصف صدی سے بھی کم عرصہ میں یہ نظام خلافت اس دنیا کے ایک بہت بڑے حصہ پر قائم ہو چکا تھا۔ یہ تینوں وعدے جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے امہ سے کئے تھے' بہت جلد سچ ثابت ہوئے۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا۔ اب تقریباً تیرہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ وہ کون سے حالات تھے جن سے مسلم امہ دوچار ہوئی اور آج ہم لوگ کہاں کھڑے ہیں۔ اس کی وضاحت کے لئے میں ایک حدیث کا حوالہ دینا چاہتا ہوں یہ حدیث امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں نقل کی ہے اور یہ حضرت نعمان ابن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ میں نے اپنی گفتگو کے آغاز میں آپ کے سامنے اس کا مکمل متن پڑھا ہے اور اب میں اس کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔ اس حدیث میں حضور ﷺ نے اپنی بعثت سے لے کر اس دنیا کے آخر تک پانچ زمانوں کی خبر دی ہے۔

۱۔ حضور ﷺ کا زمانہ جسے آپ نے بہترین زمانہ قرار دیا ہے۔

۲۔ زمانہ خلافت راشدہ جو بالکل آپؐ کے قائم کردہ سیاسی' سماجی اور معاشی نظام پر مبنی تھا جو حضور ﷺ نے پورے خطہ عرب میں ایک بہت بڑے انقلاب کے ذریعے قائم کیا تھا۔ اس نظام میں ایک شوشے کی بھی تبدیلی دور خلافت راشدہ میں نہ کی گئی تھی۔

۳۔ اس کے بعد تیسرا زمانہ تھا۔ جسے حضور ﷺ نے ظالمانہ بادشاہت سے تعبیر کیا تھا۔ اس زمانے میں بادشاہت قائم تھی۔ حالانکہ بادشاہ اپنے آپ کو خلیفہ ہی کہلواتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے لئے محلات تعمیر کئے تھے۔ اپنے لئے سامان تعیش پیدا کیے۔

۴۔ اس کے بعد چوتھا زمانہ تھا۔ جو سب سے اہم تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے تمام بادشاہ قانونی طور پر مسلمان تو تھے۔ اور حضور ﷺ کو اللہ کا رسول مانتے تھے۔ لیکن جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ چوتھا زمانہ جابر قسم کے حکمرانوں کا زمانہ تھا جنہوں نے مسلمانوں کو غلام بنائے رکھا اور یہ نو آبادیاتی نظام کا زمانہ تھا۔ اور یہ زمانہ تمام مسلم امہ پر آیا تھا۔ مسلم امہ کے کچھ ممالک دو سو سال تک اور کچھ ڈیڑھ سو سال تک اور کچھ اس سے کم عرصہ تک غلام بنے رہے۔

اب یہ بات نوٹ کی جائے جیسا کہ بھائی ابو طلحہ کہہ رہے تھے کہ گو براہ راست نو آبادیاتی نظام اختتام پذیر ہو چکا ہے۔ اور ہم اپنے آپ کو آزاد تصور کرتے ہیں۔ اور کہہ لیجئے کہ پچاس یا ساٹھ سے زیادہ ممالک میں جو اپنے آپ کو آزاد کہتے ہیں لیکن اصل میں وہ زمانہ غلامی ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ اگرچہ براہ راست غلامی کا زمانہ اختتام پذیر ہو چکا ہے۔ لیکن ابھی تک ہم لوگ غلام ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب ہم بالواسطہ طور پر غلام ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگ برصغیر پاک و ہند سے تعلق رکھتے ہیں اور ہم کافی عرصہ تک برطانیہ کے غلام رہے۔ بادشاہ یہاں برطانیہ میں ہوتا تھا۔ جبکہ اس کا نائب (وائسرائے) دہلی میں تھا۔ اسی طرح آج عملاً تمام مسلم ممالک کے حکمران امریکہ کے نائب ہیں۔ وہ اپنے ممالک کو امریکہ کی پالیسیوں اور نئے عالمی نظام کے مطابق چلا رہے ہیں۔ ہمارے وسائل دوسری اقوام استعمال کر رہی ہیں۔ ہماری پالیسیاں کہیں اور بنتی ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہمارے اندر حقیقی ایمان نہیں ہے۔ اگرچہ وہ براہ راست نو آبادیاتی نظام اختتام پذیر ہو چکا ہے۔ لیکن ابھی ان کا بالواسطہ تسلط برقرار ہے۔ اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اسے بھی ختم ہونا ہے اور یہ ہو کر رہے گا۔ اس لئے کہ حضورؐ نے اس دور کے ختم ہونے کی بشارت واضح الفاظ میں دی ہے اور ہمارے لئے دوسری خوشخبری یہ ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ اس کے بعد پھر نظام خلافت قائم ہو گا جو بالکل حضورؐ کے قائم کردہ نظام سیاست اور نظام معیشت کے مطابق ہو گا۔ پوری مسلم دنیا ایک ہو گی۔ پوری مسلم دنیا کا ایک حکمران ہو گا۔ یہ نظام نہ صرف مسلم دنیا میں بلکہ پوری دنیا میں غالب ہو گا۔ ایک سے زیادہ احادیث میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ قیامت سے قبل دنیا میں دوسری بار نظام خلافت رائج ہو گا تو وہ دنیا کے کسی ایک حصہ کے لئے نہیں ہو گا بلکہ پوری دنیا میں رائج ہو گا۔ دنیا میں بسنے والے تمام انسان اس کے تابع ہوں گے اس لئے کہ ہمارا ایمان ہے کہ حضورؐ کو پوری انسانیت کے لئے نبی بنا کر بھیجا گیا تھا اور آپؐ کا دور رسالت قیامت تک جاری رہے گا۔ اس اعتبار سے یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ حضورؐ کی بعثت کا مقصد مکمل طور پر اسی وقت پورا ہو گا جب پورے کرۂ ارضی پر اللہ کا دین غالب ہو جائے گا۔ یہ ہونا ہے اور یہ ہو کر رہے گا اور جیسا کہ حضرت ثوبانؓ نے حضورؐ کی حدیث روایت کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے پوری دنیا کو میرے لئے سکیڑ دیا تاکہ میں اس کے تمام مغرب اور تمام مشرق کو اپنے سامنے دیکھ سکوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت تھی کہ میری امت کی حکومت پوری دنیا پر قائم ہو گی اور زمین کا کوئی خطہ اس سے باہر نہیں رہے گا۔ اس بارے میں بہت سی احادیث موجود ہیں لیکن وقت کی قلت کے باعث میں وہ تمام بیان نہیں کر سکتا۔

اب آیئے اس اہم بحث کی طرف کہ خلافت کا مطلب کیا ہے۔ خلافت دراصل انفرادی حاکمیت کی ضد ہے۔ اس کائنات میں حکومت کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ لہٰذا جو کوئی بھی اپنے آپ کو حکم دینے اور اپنی مرضی کا نظام زمین پر نافذ کرنے کا اہل سمجھتا ہے وہ دراصل اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے برابر تصور کرتا ہے۔ قرآن نے صاف کہہ دیا کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ "ان الحکم الا للہ" حکم دینے اور فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اسی کو حاصل ہے۔ لہٰذا اسی کا حکم مانو اور اسی کی عبادت کرو۔ خلافت کا اصل مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم جس طرح آسمانوں پر چلتا ہے اسی طرح زمین پر بھی اس کا حکم نافذ ہو۔ اس کائنات کو چونکہ اللہ نے تخلیق کیا ہے لہٰذا حاکمیت بھی اسی کا حق ہے۔ تمام انبیاء کرام بھی اللہ تعالیٰ کے خلفا ہی تو تھے۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات ان پر نازل ہوتے تھے اور وہ انہیں عملی طور پر نافذ کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی حاکمیت کا دعویٰ نہیں کیا۔ وہ بادشاہ نہیں تھے بلکہ خلفاء تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضور داؤد علیہ السلام بادشاہ تھے لیکن قرآن کہتا ہے کہ وہ بادشاہ نہیں خلیفہ تھے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ نے ساری کائنات کو پیدا کیا تو جس نے تخلیق کیا ہو حاکمیت بھی اسی کا حق ہے۔ اس کے سوا کسی اور کو کوئی حکومت کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم جس طرح نازل ہوا اسی طرح اس کا نفاذ ہونا چاہئے۔ اس میں کسی کو بھی کسی قسم کی کمی بیشی کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اکیاون فیصد سے زائد کی بات تو بہت دور کی بات ہے' صد فی صد لوگ بھی اللہ کے حکم میں کسی تبدیلی کا اختیار نہیں رکھتے۔ لیکن جہاں کوئی واضح حکم موجود نہ ہو وہاں آپ کو محدود اختیارات دیئے گئے ہیں کہ آپ قرآن و سنت کے بنائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں اہل عقل و دانش کے مشورے سے اجتہاد کر لیں۔ لیکن اس میں بھی یہ بات ضرور ملحوظ رہے کہ اللہ کی نافرمانی کی بات نہ ہو۔ جیسا کہ ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے سیاسی' معاشی اور معاشرتی معاملات انبیاء کے ہاتھوں میں تھے۔ جب بھی کسی نبی کا انتقال ہوتا اس کی جگہ اللہ تعالیٰ دوسرے نبی کو مبعوث فرما دیتے۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام کا انتقال ہوا تو ان کے بعد اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ انبیاء کرام کا سلسلہ حضرت محمدؐ پر ختم ہو گیا۔ آپؐ کے بعد کسی نبی نے نہیں آنا۔ آپؐ پر گویا شخصی خلافت کا دور ختم ہو گیا۔ چنانچہ اب خلافت مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری بن گئی ہے۔ وہ چونکہ اللہ کی حاکمیت کا اقرار کر چکے ہیں لہٰذا اب خلافت بھی انہی کا حق ہے اور وہ اب اللہ کی زمین پر اس کی حاکمیت کا نظام نافذ کریں اور اسی نظام کو قائم کرنے کا اللہ نے امت کو حکم دیا ہے۔ سورۂ نور کی آیت ۵۵ کے حوالے سے کہ جس میں اللہ نے مسلمانوں کو خلافت عطا فرمانے کا وعدہ کیا ہے' یہ بات خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہے کہ یہاں جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جبکہ حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں اللہ نے واحد کا صیغہ استعمال کیا تھا کیونکہ وہ اس وقت اپنی ذات میں اللہ کے نمائندے اور اس کے خلیفہ تھے۔ لیکن اب ختم نبوت کے بعد خلافت امت کی اجتماعی ذمہ داری بن گئی ہے۔

اب میں اپنی تقریر کے دوسرے حصے کی طرف آتا ہوں۔ یہ نظام صرف خواہش کرنے سے یا دعائیں کرنے سے قائم نہیں ہو گا۔ کیونکہ دعائیں بھی اسی

وقت قبول ہوتی ہیں جب آپ وہ سب کچھ کر چکے ہوں جو آپ کر سکتے ہیں کہ اے اللہ میرے دین کے غلبے کے لئے میں جو کچھ کر سکتا تھا میں نے کیا' اب نتیجہ تیرے ہاتھ میں ہے۔ تب جا کر دعائیں قبول ہوتی ہیں ورنہ نہیں۔ اس کے علاوہ میں ایک بات اور کہتا ہوں کہ قربانیاں بھی بعض اوقات رائیگاں چلی جاتی ہیں۔ جب تک یہ قربانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے مطابق نہ ہو نتیجہ خیز نہیں ہوتی۔ ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ مسلم دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ دس لاکھ سے زیادہ انسان افغانستان میں مارے جا چکے ہیں اور ابھی تک خانہ جنگی جاری ہے۔ لیکن وہ اسلامی ریاست اور وہ نظام خلافت کہاں ہے جس کے لئے قربانی دی گئی؟ تاہم مجھے امید ہے کہ مستقبل قریب میں اس سرزمین سے کوئی اچھی خبر ملنے کو ہے۔ قربانیاں رنگ لائیں گی۔ لیکن اب تک کے حالات بہت مایوس کن ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہم اسوۂ حسنہ سے ہٹ کر کام کر رہے ہیں' خلافت اس طرح قائم نہیں ہو سکتی۔ میں امام مالک رحمہ اللہ علیہ کا ایک قول نقل کرتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ اس امت کے آخری حصے کی اصلاح نہیں ہو سکے گی یا یوں کہئے کہ یہ امت اپنے آخری دور میں خلافت قائم نہ کر سکے گی مگر اسی طریقے پر جس پر کہ ابتدائی دور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاح فرمائی تھی اور آپ جانتے ہیں کہ اس قول کا اس حدیث مبارک سے گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ امت کا پہلا دور خلافت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ نظام کے عین مطابق یعنی خلافت علی منہاج النبوۃ تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی بشارت بھی دی ہے کہ میری امت کا آخری دور بھی خلافت علی منہاج النبوۃ کا ہو گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ نظام کے مطابق ہی نظام خلافت قائم کرنا ہو گا جس کا بھرپور عملی نمونہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے دنیا کے سامنے پیش فرمایا تھا۔ اور اگر آپ وہ عادلانہ اجتماعی نظام چاہتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا تو آپ کو بھی وہ ہی کام کرنا ہو گا جو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے کیا تھا۔

اب میں مختصر الفاظ میں بیان کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اسوۂ حسنہ کیا ہے۔ سب سے پہلے لوگوں میں حقیقی ایمان پیدا کرنا ہو گا' نہ کہ صرف زبانی اقرار۔ ہم ایک ارب سے زیادہ کی تعداد میں دنیا میں موجود ہیں جو زبانی کلامی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرتے ہیں۔ لیکن اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود دنیا میں ہماری حیثیت کیا ہے؟ ہم پوری دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہیں۔ ہمارے پاس بے پناہ وسائل ہیں' زمین کا ایک بہت بڑا حصہ ہمارے قدموں تلے موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود کیا بین الاقوامی معاملات میں کوئی ہمیں پوچھتا ہے؟ کیا کسی سطح پر ہم سے کوئی مشورہ کیا جاتا ہے؟ ہمارے وسائل دوسرے استعمال کر رہے ہیں۔ ہماری پالیسیاں کہیں اور بنتی ہیں۔ آخر یہ سب کیوں ہے؟ وجہ بالکل ظاہر ہے کہ ہمارے اندر حقیقی ایمان موجود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں فرمایا ہے کہ رنجیدہ نہ ہونا اور نہ ہی غمگین ہونا' ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ حقیقی ایمان تمہارے اندر موجود ہو۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ آج ہم غالب نہیں مغلوب ہیں۔ اگرچہ ہم مسلمان ہیں لیکن صرف قانونی طور پر مسلمان ہیں حقیقی مومن نہیں۔ کہاں ہے وہ حقیقی ایمان؟ کہاں ہے وہ اللہ تعالیٰ کی موجودگی کا عقیدہ؟ کہاں ہے وہ آخرت کی زندگی کا تصور؟ کہاں ہے وہ عقیدہ کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے احکامات ہیں کہ جن کو بجالانا ہمارا فرض ہے؟ اگر ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں تو معلوم ہو گا کہ یقین کی دولت ہم گم کر چکے ہیں۔ اگرچہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر ہیں اور قرآن اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے سینے حقیقی ایمان سے خالی ہیں۔ ہمیں اپنے حالات کا جائزہ لینا ہو گا۔ ہمیں اپنے ایمان کی تجدید کرنی ہو گی۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور قرآن کے ساتھ اپنا رابطہ دوبارہ بحال کرنا ہو گا۔ اور یہ بات جان لیجئے کہ تجدید ایمان کا واحد ذریعہ صرف اور صرف قرآن ہے۔ "وہ اللہ ہی ہے جو آسمان سے روشن آیات اور واضح نشانیاں اپنے بندے (محمدؐ) پر اتارتا ہے تاکہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لائے" (سورۃ الحدید' آیت ۹)۔ اندھیروں سے مراد کفر و شرک' نافرمانی' مال و دولت کی محبت' غرور و تکبر اور حرص و طمع وغیرہ۔ یہی وہ اندھیرے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ آپ کو نکالنا چاہتا ہے اور اس کے لئے واحد ذریعہ قرآن ہی ہے۔ اس کے لئے ایک بہت بڑی انقلابی مہم شروع کرنی ہو گی تاکہ لوگوں میں حقیقی ایمان پیدا ہو سکے۔ یہ وہ کام تھا جس پر محمدؐ کم و بیش بارہ برس تک مکہ میں کمربستہ رہے۔ آپؐ وہاں کیا کام کر رہے تھے (ترجمہ) "وہ لوگوں کو اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔" (سورۃ الجمعہ' آیت ۲) یہ آپؐ کی محنت کا پہلا مرحلہ تھا۔ دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ جو کوئی بھی ایمان لاتا تھا آپؐ اس کو جماعتی نظم اور ڈسپلن کا خوگر بناتے۔ حضرت حارث الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک حدیث روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے یہ عہد لیا تھا کہ ہم جماعت سے وابستہ رہیں گے' ہر حکم سنیں گے اور اطاعت کریں گے اور اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کریں گے۔ اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول تھے اور جو کوئی بھی آپؐ پر ایمان لاتا تھا اسے آپؐ کا ہر حکم ماننا ہوتا تھا کیونکہ آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی اور ہر حال میں اس پر عمل لازمی تھا۔ لیکن اس کے باوجود آپؐ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے یہ عہد لیا تھا کہ جو حکم بھی تمہیں دوں گا تمہیں ہر حال میں اس پر مکمل طور پر عمل کرنا ہو گا۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد کیا تھا کہ آپ جو بھی حکم ہمیں دیں گے چاہے وہ مشکل ہو یا آسان' چاہے ہمارا دل عمل کرنے کو چاہے یا نہ چاہے۔ چاہے ہمیں اپنے اوپر جبر کرنا پڑے' چاہے آپ دوسروں کو ہم پر ترجیح دیں۔ ہم ہر حال میں آپ کا حکم مانیں گے اور یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ سنت ہے جو آپؐ نے بعد میں آنے والوں کے لئے چھوڑی ہے۔ کیونکہ اب جبکہ دوسری مرتبہ نظام خلافت رائج ہو گا کوئی نبی اب نہیں آئے گا نہ کسی رسول نے اب آنا ہے۔ یہ کام کسی امتی ہی کو کرنا ہو گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانثاروں میں سے کوئی اس انقلابی جدوجہد کی قیادت کرے گا اور اس سے سمع و طاعت کا عہد کرنا ہو گا۔ اس حدیث میں اسلامی انقلابی جماعت کا مکمل دستور موجود ہے جو اس جماعت کی بنیاد ہو گا جس کے ذریعہ اس دنیا میں نظام خلافت رائج ہو گا۔ واضح رہے کہ یہ حدیث جو میں نے آپ کو سنائی ہے' متفق علیہ ہے۔ اسے امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے نقل کیا ہے۔ یہ انقلابی عمل کا دوسرا مرحلہ ہو گا۔ لیکن اس سے پہلے ہر شخص کو اپنے نفس کا تزکیہ کرنا ہو گا۔ یہ نہ ہو کہ ظاہری طور پر آپ

(باقی صفحہ ۷ اپر)

باغ بیرون موچی دروازہ کے بوڑھے درختوں نے حیرت سے دیکھا

یہاں کیسی کیسی بولیاں نہیں بولی گئیں!

نجیب صدیقی

جلسۂ خلافت ا پنی نوع کا انوکھا جلسۂ عام تھا

لاہور کا موچی دروازہ' وجہ تسمیہ کچھ بھی ہو ایک عرصہ سے جلسہ و جلوس کا مرکز بنا ہوا ہے' نصف صدی سے تو ہم بھی دیکھ رہے ہیں' اس سے قبل بھی یقیناً یہاں اجتماعات ہوا کرتے ہوں گے۔ جب آزادی کی تحریک متحدہ ہندوستان میں چلی تھی تو اس جگہ سے یقیناً نعرے بلند ہوئے ہوں گے کہ پاکستان کا مطلب کیا لاالہ الااللہ ---- اس تاریخی جگہ نے کتنے نشیب و فراز دیکھے ہوں گے' کتنے اتار چڑھاؤ کے منظر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرے ہوں گے۔ اس وسیع میدان کے ایک گوشے میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یہ بلند و بالا درخت جو آج بلندیوں کی چھو رہے ہیں جب اس کے کنارے لگائے گئے ہوں گے تو وہ ان کا بچپن ہو گا' وہ جوان ہوئے اور آج اپنی کہولت کے باوجود تنے کھڑے ہیں۔ یہ درخت دنیا کے اور درختوں سے کتنے مختلف ہیں۔ انہوں نے سیاسی ہنگامے بھی دیکھے ہیں' فلک شگاف نعرے بھی سنے ہیں' زندہ باد مردہ باد کا جوش و فروش بھی دیکھا ہے۔ محفل نعت کا مزہ بھی لیا ہے' سیرت کے جلسے بھی سنے ہیں۔ وہ شخصیات جو آج ہم میں نہیں ہیں' انہیں بھی دیکھا ہے۔ ہمیں تو ان کے قصے کہانیاں کتابوں کے اوراق ہی میں ملتی ہیں۔ کیسے کیسے زعماء آئے' گھن گرج کر چلے گئے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں حزب اختلاف والے حزب اقتدار پر برستے رہے اور حزب اقتدار والے حزب اختلاف پر غداری کا الزام دھرتے رہے۔ تحریکوں نے یہیں اپنی محفل سجائی ہے۔ لاٹھی چارج سے فائرنگ تک ایک ایک بات یقیناً یاد ہو گی۔

چشم تصور نے وہ منظر بھی دیکھا جب اس جگہ پر ایک اسلامی جماعت کا قائد جوش و جذبے میں بول رہا تھا۔ بہت کم لوگ جوش میں ہوش کو قائم رکھتے ہیں۔ اس کے منہ سے یہ تاریخی جملے ادا ہوئے "فاطمہ جناح میں کوئی عیب نہیں سوائے اس کے کہ وہ ایک عورت ہے اور صدر ایوب میں کوئی خوبی نہیں سوائے اس کے کہ وہ ایک مرد ہے"۔

اس اسلامی لیڈر نے اگر یہ بات نہ کہی ہوتی اور ایک عورت کو سربراہ بنانے کے لئے اپنی ساری مساعی کو جھونک نہ دیا ہوتا تو آج یہ مسئلہ اتنا متنازع نہ بنتا --- پیپلزپارٹی والوں پر اس کا اتنا بڑا احسان ہے کہ جس سے وہ سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اس پارٹی نے اس احسان کی قدر نہ کی' ورنہ اپنی صفوں میں کوئی نہ کوئی گنجائش نکال سکتے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ قیامت کے دن انسانی اعضاء اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ اس کے ہاتھ پاؤں کو زبان دے دی جائے گی' اور وہ اس شخص کے خلاف گواہ بن کر کھڑے ہو جائیں گے۔ اسی طرح یہ درخت بھی گواہ بن سکتے ہیں۔ یہ چشم دید گواہ جب اللہ کی دی ہوئی زبان سے گویا ہوں گے تو کسی کی ایک نہ چلے گی۔ تم نے دنیا کی خاطر' اقتدار کی خاطر کیسے کیسے الزامات لگائے۔ تم دنیا کے پیچھے شکاری کتے کی طرح بھاگتے رہے۔ یہ نہ سوچا کہ دنیا میں تمہارے آنے کا مقصد کیا ہے۔ اپنی سیادت اور قیادت کا رنگ جمانے کے لئے سیدھے سادھے عوام سے جھوٹے وعدے کرتے رہے اور بے وقوف بناتے رہے۔

اس تاریخی جگہ پر میں کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ بلند و بالا اسٹیج جو ان جلسوں کے لئے مستقل حیثیت رکھتا ہے' تحریک خلافت کے بینروں سے سجا ہوا ہے۔ جلسہ میں ابھی دیر تھی' ابھی ابھی تو تحریکِ خلافت کی ریلی قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن سے ایک لمبا چکر کاٹتی ہوئی پہنچی تھی۔ یہ ریلی جس میں بسیں بھی تھیں' گاڑیاں بھی تھیں' موٹر سائیکل پر تیزی سے دوڑنے والے نوجوان اسے کنٹرول کر رہے تھے' ایک لمبی قطار لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہوئی جلسہ گاہ کی طرف رواں دواں تھی۔ اسپیکر سے آواز بلند ہو رہی تھی کہ اے لوگو ہم تمہارے ووٹ کی خاطر تم سے مخاطب نہیں ہیں ہم تو اس نظام کے لئے کوشاں ہیں جو تمہاری تمام مشکلات کے حل کا ضامن ہے۔ اس ریلی میں شریک ہونے والے افراد خیبر سے کراچی تک کی نمائندگی کر رہے تھے' تنظیم اسلامی پاکستان کے سالانہ اجتماع میں آنے والے یہ لوگ آج اہل لاہور سے پوچھ رہے تھے کہ تم کب بیدار ہو گے' اٹھو اللہ کے کلمہ کو بلند کرو' وہ نظام قائم کرو جس کے لئے یہ ملک حاصل کیا گیا تھا اور تم نے اللہ سے وعدہ بھی تو کیا تھا ---- ریلی سڑک کے ایک کنارے سے گزر رہی تھی' ٹریفک کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ ہمارے نوجوان چوراہوں پر کھڑے ریلی کے گزرنے کا راستہ بنا رہے تھے۔

نماز عصر کے بعد روانہ ہونے والی یہ ریلی جب موچی دروازہ پہنچی تو اس وقت مغرب کی آذان ہو رہی تھی۔ تمام شرکاء مسجد کی طرف بڑھے۔ مسجد نے آنے والوں کا استقبال کیا۔ اس وقت اسے اگر زبان مل جائے تو وہ آنے والوں سے مخاطب ہو کر کہے کہ اے وہ لوگو جو اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے اپنا گھر بار چھوڑ کر آئے ہو ہم تمہارے پیر کے تلووں سے اپنے جسم کو مس کرتے ہوئے مسرور ہیں۔ اس کی راہ میں نکلنے والے ہر قدم کو چوم کر تمنا کرتے ہیں کہ اے کاش اللہ ہمیں بھی تمہاری طرح اعضاء و جوارح دے دے تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکل کھڑے ہوں ----- اللہ کے یہ بندے نماز مغرب سے فارغ ہو کر جلسہ گاہ پہنچے تو اللہ اکبر کے نعروں نے ان کا استقبال کیا۔ اللہ ہی بڑا ہے' اسی کی کبریائی کے اعلان کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

اسٹیج سے متصل تقریباً بیس تیس فٹ بلند ایک پردہ لگایا گیا تھا' جس پر پروجیکٹر کے ذریعہ وہ فلم دکھائی جا رہی تھی جو لندن میں منعقد ہونے والی خلافت کانفرنس میں تنظیم اسلامی کے سربراہ کی تقریر تھی۔ "دیوانۂ خلافت" اپنی پرجوش تقریر میں دنیا سے مخاطب تھا۔ اس کی یہ تقریر "پروانۂ خلافت" بڑے انہماک سے سن رہے تھے۔ یہاں بھی یہی منظر تھا۔ مجھے ایک شعر یاد آ رہا تھا۔

رخ لیلیٰ ہی کو چاہیں یہ کوئی شرط نہیں
اپنے مقصد کا جو عاشق ہے وہی ہے مجنوں

کراچی سے پشاور اور آزاد کشمیر تک لوگ اپنا پیسہ اور وقت صرف کر کے یہاں کیوں آئے تھے' انہیں کیا لالچ تھی' انہیں کس نے مجبور کیا تھا۔ اس دور میں وقت کی سب سے بڑی قیمت ہے۔ سفر کی صعوبتیں اٹھانے کے بعد اپنا قیمتی وقت خرچ کر کے پہنچنا' بلا مقصد تو نہیں ہو سکتا' یقیناً ایک مقصد تھا۔ اس سے بڑا اور کوئی مقصد نہیں ہو سکتا یعنی ادائیگی فرض اور اپنے رب کی رضا کا حصول!! ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو سمندر پار بہت سے ممالک سے کشاں کشاں پہنچے تھے۔ کیا یہ سب کچھ یونہی تھا۔ ان کے اس جذبے اور ایثار کو ناپنے کا کوئی پیمانہ ممکن ہے؟ اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کا عزم اور اس کی راہ میں خرچ ہونے والا ایک ایک لمحہ اس جگہ "اسٹور" ہو رہا تھا' جہاں پہنچنا یقینی ہے شدنی ہے۔

حدِ نگاہ تک کرسیوں کی قطاریں آنے والوں کی منتظر تھیں۔ لوگ آ رہے تھے اور اپنی اپنی نشست سنبھال رہے تھے' اسٹیج سے وقتاً فوقتاً قلوب کو گرما دینے والے نعرے لگ رہے تھے۔ یہ نعرے زندہ باد یا مردہ باد کے نہ تھے' بلکہ خلافت کے خدوخال کو اجاگر کرنے کے لئے قافیہ بند الفاظ بڑے خوبصورت انداز میں مرتب شدہ تھے' لوگوں کو جگا رہے تھے' بتا رہے تھے' سنا رہے تھے اٹھو! خلافت کو از سرنو استوار کرنے کے لئے کمر ہمت کسو!!

عشاء کی اذان ہوئی' لوگ مسجدوں کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ جلسہ اور جلوس میں نماز کے اوقات کا خیال اکثر لوگ نہیں کیا کرتے' حاضری کم ہو جانے کا اندیشہ انہیں وقفہ دینے سے روک دیتا ہے' یہاں ایسی بات نہ تھی' یہاں تو اقامتِ صلوٰۃ کے نظام کو قائم کرنے کا عزم لے کر اٹھے تھے۔ نماز کو کیسے مؤخر کر دیتے۔ جلسہ اپنے وقت پر شروع ہوا' تمام کرسیاں بھر چکی تھیں' جلسہ گاہ کے کنارے سیڑھیوں پر لوگ بیٹھے مقررین کو سن رہے تھے۔ ہمارا نوجوان مقرر مرزا ندیم بیگ پرجوش انداز میں قیامِ خلافت کی بات کر رہا تھا۔ اس کے قلب کی گرمی الفاظ کے قالب میں ڈھل کر لوگوں کو ایک نیا ولولہ دے رہی تھی اس نے ملک کے حالات کا جائزہ لیا جو یقیناً تلخ تھا۔ ہمارے معاشرے میں یہ تلخی سیاست دانوں نے گھولی ہے۔

میجر جنرل ریٹائرڈ محمد حسین انصاری صاحب نے پاکستان کے دولخت ہونے کا ذکر بڑے درد بھرے انداز میں کیا۔ آپ نے بچشم خود مشرقی پاکستان کو الگ ہوتے دیکھا ہے۔ آپ نے ان اسباب پر روشنی ڈالی جو علیحدگی کا سبب بنے ہیں۔ آپ نے فرمایا تھا کہ جنگ کا دن منانے سے بہتر ہے کہ ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کا دن منایا جائے۔ پاکستان کے دولخت ہونے کا کون ذمہ دار ہے' اس پر غور کریں اس سے عبرت پکڑیں۔

راقم کے نزدیک ہمارے حکمرانوں میں عبرت پکڑنے کا خانہ خالی ہے۔ ایک شاعر نے اس کی یوں ترجمانی کی ہے۔

ارے یہ اہل سیاست ہیں ان کی مت پوچھو
وہی کریں گے یہ بعد از خرابیٔ بسیار

اس وقت جو ملکی حالات ہیں انہیں خراب کرنے کے ذمہ دار ہمارے یہی حکمران ہیں۔ ذاتی مفاد اور پارٹی مفاد سے بلند ہونا انہوں نے سیکھا ہی نہیں۔ اس وقت ملک کے حالات کسی اعتبار سے ۱۹۷۱ء سے مختلف نہیں ہیں۔ وہی ناانصافی' وہی دوہرا معیار' وہی ظلم' وہی استحصال زور شور سے جاری ہے۔ "بھاگتے بھوت کی لنگوٹی" گھسنے میں ہر شخص لگا ہوا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ وہ نظام جس میں عقیدے کی طاقت نہ ہو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ وہ تارِ عنکبوت بن جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں جو نظام چل رہا ہے اس کی بھی وہی حالت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قانون کی حکمرانی مفقود ہے۔ اس اعتبار سے بھی اگر دیکھا جائے تو "نظامِ خلافت" ہماری ضرورت ہے۔ عوام الناس کی عظیم اکثریت اس کے ساتھ وہی عقیدت رکھتی ہے جسے ہم ایمان کہتے ہیں۔ ہمارے دین کا تقاضہ بھی یہی ہے' ہمارے ایمان کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ وہ نظام اپنی سرزمین پر پہلے اور دنیا میں اس کے بعد نافذ کرنے کی کوشش کریں۔ یہی کوشش' یہی جد و جہد تنظیم اسلامی کے امیر کو کشاں کشاں لئے پھرتی ہے' تنظیم کے قیام کی غرض و غایت بھی یہی ہے یہ اجتماع اس کے اظہار کے لئے منعقد کیا گیا تھا۔ داعیٔ تحریک نے اپنے خطاب میں وہی باتیں دھرائیں اور اسی "درد" کو سامعین کے ذہنوں میں "انجیکٹ" کیا جو وہ خود لئے پھرتے ہیں۔OO

امریکی عزائم اور اقوامِ عالم کا اضطراب

چچا سام کا اپنا مالیاتی نظام شاخِ نازک پہ آشیانہ ہے

دنیا بھر کو معاشی جبر کی زنجیروں میں جکڑنے والے دورِ غلامی کی یاد تازہ کر دیں گے

حبیب اللہ شاہد

ماسکو کی ہمسایہ ملک افغانستان پر لشکر کشی نے سیاست کے عالمی افق پر جن تبدیلیوں کا آغاز کیا تھا اس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ روسی لشکر کشی نے دنیا کے سیاسی جغرافیے کو اس طرح تبدیل کیا کہ کئی خود مختار ریاستیں یکایک نمودار ہو گئیں اور تقریباً سارے مشرقی یورپ کو اس عمل نے متاثر کیا۔ کیمونزم کا تراشیدہ دیو قامت بت ٹوٹنے کے بعد اقوام عالم میں امریکہ واحد سیاسی عسکری اور معاشی طاقت کے طور پر نمودار ہوا۔ یہ وہ سنہرا وقت تھا جب امریکی پالیسی سازوں نے یہ تہیہ کر لیا کہ فریڈرک ہرٹز (Frederick Hertiz) کے اس مشورے پر پوری توانائی کے ساتھ عمل کرنے کی کوشش کریں گے جو اس نے اپنی کتاب

"Nationality in history and politics"

کے صفحہ آخر پر دیا تھا۔ وہ نظریہ یہ تھا کہ دنیا کی تمام اقوام کو اپنے ہاں ایک جیسا معاشی اور معاشرتی (سرمایہ دارانہ نظام) قائم کر لینا چاہئے۔ چنانچہ عالمی حکومت کا قیام امریکی پالیسی سازوں کا مطمع نظر ہے تاکہ پوری دنیا کے معاشی اور معاشرتی حالات کو اپنے تابع فرمان بنا کر حکمرانی کا اصل مزا چکھا جائے۔ حالات بھی بظاہر اسی

رخ پر جا رہے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ آئندہ برسوں میں پوری دنیا امریکی سلطنت کی حیثیت اختیار کر جائے گی۔

لیکن حقیقت پسندانہ تجزیئے سے یہ بات بھی آشکارا ہو رہی ہے کہ عصر حاضر کی یہ واحد سپر پاور عالمی سطح پر عدم اعتماد کا شکار ہے اور اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ امریکہ کی لرزہ براندام کیفیت عالمی قیادت کی بساط لپیٹنے کے قابل نہ رہے۔ بظاہر داخلی انتشار ہویدا نہیں لیکن سیاسی و معاشی ماہرین گذشتہ چند ماہ سے بڑی شدت کے ساتھ ان خطرات کی نشاندہی کر رہے ہیں جو نیوکلیئر' حیاتیاتی' کیمیائی اور لیزر ہتھیاروں کی حامل اس قوت کو نہ صرف غیر مستحکم ہی کر دیں گے بلکہ بتدریج اس ملک کو روس جیسے عبرتناک انجام سے دوچار کر دیں گے۔

امریکہ کی بگڑتی ہوئی داخلی صورت حال اس قیاس کی تصدیق کرتی ہے کہ امریکی عوام گھمبیر بحرانوں کا شکار ہیں اور ملک میں شفاف سیاسی عمل کی راہیں مسدود ہوتی جا رہی ہیں۔ گذشتہ انتخابات میں امریکہ کی نصف آبادی نے حصہ ہی نہیں لیا۔ امریکہ کے سیاست دان بھی انتہا درجے کی کرپشن کا شکار ہیں۔ ان میں سے بیشتر تیسری دنیا کے ممالک سے مختلف حیلے بہانوں کے ذریعے بھاری رقوم وصول کر رہے ہیں۔ ماضی قریب میں انارکی اور لاقانونیت کے متعدد واقعات کو امریکی انتظامیہ نے نہایت بے رحمی کے ساتھ کچلا ہے۔ امریکی معاشرے میں خوف و ہراس پھیلتا جا رہا ہے۔ سیاسی' معاشی اور معاشرتی تفاوت میں نہایت تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا ہے' خصوصاً اقتصادی مسائل نے امریکی معیشت کو اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے۔ تباہی کے کنارے پر کھڑی امریکہ کی اقتصادی صورتحال کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۸۵ء کے عشرہ میں امریکہ کا بجٹ بالکل نہیں تو کم از کم توازن کے قریب تھا اور سالانہ خسارہ صفر کے قریب تھا لیکن ۱۹۹۰ء کے عشرے میں امریکی بجٹ کا سالانہ خسارہ ۵۵۵ کھرب ہو گیا۔ خسارے کی شرح کی رفتار اسی طرح رہی تو اندازہ لگایا جا رہا ہے کہ ۲۰۰۰ء تک امریکہ کو نہایت ہی گھمبیر مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اسی طرح قرضوں پر سالانہ سود ۱۹۸۵ء میں صفر تھا جو ۱۹۹۰ء میں بڑھ کر ۵ء۳۰ کھرب ہو گیا اور ۲۰۰۰ء تک یہ ۳۵ کھرب ڈالر ہو جائے گا۔

اقتصادی بدحالی نے امریکہ کی سیاہ فام اور رنگ دار آبادی میں بے روزگاری کی شرح میں خطرناک حد تک اضافہ کر دیا ہے۔ مذہبی' نسلی اور طبقاتی امتیازات نے امریکی عوام کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرتیں اور تعصب پیدا کرنا شروع کر دیا ہے اور یہ صورت حال آئندہ چند برسوں میں امریکہ کو خانہ جنگی کی جانب بھی دھکیل سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست کے ماہرین معاشیات' اہل فکر و نظر اور ارباب حکومت مملکت کی بگڑتی ہوئی سیاسی' سماجی اور اخلاقی صورت حال کے پیش نظر ریاستوں کو متحد رکھنے اور عوام کو بدحالی سے نجات دلانے کے لئے منصوبہ بندی کر رہے ہیں اور توقعات و ترجیحات مرتب کرنے میں رات دن ایک کئے ہوئے ہیں۔ اس وقت امریکیوں کے لئے فوری اور توجہ طلب بحث یہ ہے کہ وہ اپنے کثیر المقاصد مفادات کو تحفظ فراہم کرنے اور انہیں مستحکم رکھنے کے لئے کس قسم کی دنیا تشکیل دینا چاہتے ہیں اور وہ کون سے طریقے ہیں جن سے عالمی قیادت کی بالادستی ہمیشہ کے لئے استوار کی جا سکتی ہے۔ فی الوقت امریکی قیادت کے ذہن میں نیو ورلڈ آرڈر کے ذریعے اقوام عالم کو سرنگوں کرنے کا سودا سمایا ہوا ہے۔ اپنے ان عزائم کی تکمیل کے لئے امریکی قیادت اپنے عوام کی تائید اور اعتبار حاصل کرنے کے لئے داخلی اور خارجی پالیسیوں پر نظر ثانی کر رہی ہے اور یہ ساری کوششیں امریکی قیادت کے اس عریاں پن کو ظاہر کرتی ہیں جو حکمرانی کے مزاج نے ان کے اندر پیدا کر دیا تھا۔

امریکہ کے ان جارحانہ عزائم کے پیش نظر اقوام عالم کا ردعمل بھی اظہر من الشمس ہے۔ دنیا کی بیشتر اقوام امریکہ کی یک قطبی (Unipolar) حکمرانی سے نالاں ہیں اور اپنے تئیں اس بات کی خفیہ اور کھلی کوششوں میں مصروف ہیں کہ کس طرح استبدادی نظام سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ بین الاقوامی ڈپلومیسی نے یہ بات عیاں کر دی ہے کہ یورپ کے چند استحصالی ملکوں اور امریکہ کے ماسوا دنیا کی تمام اقوام مساوات اور برابری کے اصولوں پر مبنی ایک آزاد سیاسی و تجارتی نظام کی متمنی ہیں۔ لیکن آزادی اور خود مختاری کے عالمی ٹھیکے دار کی دور رخی حکمت عملی آزاد اقوام کے لئے سوہان روح بنی ہوئی ہے۔ امریکہ اقوام عالم پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لئے "نظریہ موافقت" کے جال بن رہا ہے اور اقوام کی حقیقی آزادی کو سلب کرنے کے در پے ہے۔ اگرچہ امریکہ اپنے مقاصد میں کامیابیاں حاصل کر رہا ہے جو اس کی تنہا پرواز کو تقویت دینے کا سبب بن رہی ہیں لیکن ساتھ ہی امریکی پالیسی ساز اس خوف اور اندیشے میں بھی مبتلا ہیں کہ جوہری توانائی کی حامل دیگر اقوام' NPT جیسے معاہدوں کی تنسیخ کر کے امریکی مفادات کو چیلنج نہ کر بیٹھیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ اور اس کے استحصالی گروپ کے دیگر نمائندے نہایت بے رحمی کے ساتھ معاشی و تجارتی پابندیوں کے حربے استعمال کر رہے ہیں۔ خود اقوام متحدہ کا ادارہ بھی امریکی مفادات کے تحفظ کے لئے ترقی پذیر ممالک کے خلاف تاخیری حربوں اور جبری پابندیوں کا استعمال جس طرح کر رہا ہے اس کی مثال اب سے قبل ناپید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی طور پر امریکی اقدامات کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جا رہا۔ ذرائع ابلاغ میں عالمی سیاست کے ناقدین کی آراء و تجاویز سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکی طرز عمل کے باعث اقوام عالم میں اضطراب کی لہر دوڑی ہوئی ہے۔ اسی حقیقت کے پیش نظر امریکی دانشوروں کا خیال ہے کہ ان کا ملک اگر عالمی قیادت سے دستبردار ہو جائے تو زیادہ اچھا ہے۔ یہ حضرات امریکی رائے عامہ کو تبدیل کرنے کے لئے جو دلائل دیتے ہیں ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ!

☆ کمیونزم کی موت اور خاص طور پر مشرقی یورپ اور روس کی پاریدگی کے بعد امریکہ کو عالمی قیادت سے دستبردار ہو جانا چاہئے۔

☆ چونکہ امریکہ نے سرد سرجنگ (War Cold) کا زبردست معاشی بوجھ اٹھایا ہے اور قومی معیشت تباہی کے کنارے پر پہنچ گئی ہے لہٰذا ہمیں اپنی عالمی قیادت کو ترک کر کے داخلی اصلاح کی جانب توجہ دینی چاہئے۔

☆ بالفرض امریکہ ہی ایسی واحد سپر پاور ہے جو عالمی قیادت کی اہل ہے تب بھی قومی مسائل کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے پیش نظر عالمی قیادت سے کنارہ کشی کو ترجیح دینی چاہئے۔

☆ بجٹ میں خسارے نے قومی معیشت کو مفلوج کر دیا ہے اور غیر متوازن تجارت نے امریکی ڈالر کی ساکھ گرا دی ہے۔ امریکہ کے عالمی اقتصادی نظام نے ترقی پذیر ممالک کے مفادات کو نقصان تو پہنچایا ہی ہے لیکن سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف لوگوں کی نفرت میں اضافہ ہو رہا ہے اور اقوام عالم اس نظام سے بالا کوئی اور نظام دیکھنے کی متمنی ہونے لگی ہیں۔ ایسے میں امریکہ عالمی اقتصادیات میں غیر ضروری طور پر اپنی ٹانگ نہ اڑائے۔

☆ گھمبیر داخلی مسائل' سماجی روابط میں بگاڑ' بہبودی و فلاحی کاموں کی معدومی' اقوام سے جوہری توانائی کا حق چھیننا' ان کی دفاعی صلاحیت کو اپنا تابع فرمان بنانا' ترقی پذیر ممالک کی معیشت کو امریکی سود سے لاد دینا ایسے عوامل ہیں جن کی بنا پر امریکیوں سے نفرت بڑھتی جا رہی ہے۔ اندیشہ ہے کہ اس طرز عمل کے باعث ایک دن امریکی اپنے آپ کو دیگر اقوام کے مقابلے میں تنہا محسوس کرنا شروع کر دیں گے۔

تاہم امریکہ کی پالیسی ساز اور حکمران پارٹی متفقہ طور پر ان دلائل کو مسترد کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ بات بھی پوری صداقت کے ساتھ جلوہ گر ہے کہ کلنٹن انتظامیہ ہنوز اپنے انتخابی منشور میں پیش کردہ وعدوں پر عملدرآمد کے لئے سرگرداں ہے اور اسے داخلی طور پر امریکی عوام کے مسائل حل کرنے میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ ہر آنے والا دن امریکیوں کے لئے مسائل کا انبار لے کر طلوع ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی عالمی سیاست میں بھی امریکہ کے رقیبوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے لیکن امریکی پالیسی سازوں کے طرز عمل کی ایک اور مثال مبصرین کی اس رائے کو بھی کلی طور پر مسترد کر دینا ہے جس کے مطابق کلنٹن انتظامیہ غیر سفید فام نسلوں کو جبر و تشدد اور معاش کی زنجیروں میں جکڑنے کے وہ اسباب پیدا کر رہی ہے جو دور غلامی (Salavery Age) کا اعادہ کر دیں گے۔

امریکی پالیسی سازوں کے نزدیک عالمی قیادت سے دست بردار ہونا امریکی قوم کے لئے کسی طرح بھی سود مند نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جوہری' خلائی' عسکری اور مواصلات کی ٹیکنالوجی میں کوئی قوم امریکہ کے ہم پلہ نہیں۔ اسی طرح امریکہ کی خفیہ ایجنسیوں کو اس بات میں انتہا درجے کی مہارت حاصل ہے کہ وہ خودسر اقوام کو اپنے مکارانہ حربوں کے ذریعے راہ راست پر لے آتی ہیں۔ امریکہ کی بے پناہ قوتیں اور صلاحیتیں اس حقیقت کی بھرپور غمازی کرتی ہیں کہ امریکہ عالمی قیادت کے لئے بے مثال ہے اور اس انتہائی مستحکم ریاست کو دنیا کی کوئی قوت عالمی قیادت کے انمول جوہر سے محروم نہیں کر سکتی۔

امریکی قیادت کا یہ فرعونی طرز عمل محض اس کی عسکری' معاشی اور سیاسی برتری کے باعث نہیں بلکہ جوابی قوت ارادی اور سفارت کاری کے عیارانہ اور حسابی طریقے (Calculated Methods) وہ خفیہ ہتھیار ہیں جو اقوام عالم پر فیصلہ کن اثرات مرتب کر کے انہیں اپنا تابع فرمان بنا لیتے ہیں۔ خود سر ممالک میں امریکی پالیسیاں اور ان کے شاطرانہ ایجنٹ بظاہر حملہ کئے بغیر داخلی انتشار برپا کر کے اپنے مقاصد حاصل کر لیتے ہیں۔ اس پر طرۂ امتیاز یہ ہے کہ امریکہ سیاسی اقتدار کا پرچار کرتے نہیں تھکتا۔ دراصل یہی وہ قوتیں ہیں جن کی موجودگی کے باعث امریکہ عالمی قیادت سے تہی دامن نہیں ہونا چاہتا۔

جرمنی اور جاپان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ان دونوں ممالک نے مارک اور ین کے ذریعے امریکہ کو معاشی میدان میں شکست دی لیکن اس کے باوجود معاشی و اقتصادی طور پر مستحکم یہ دونوں ریاستیں عسکری ٹیکنالوجی سے محرومیت کے باعث امریکہ کی مطیع و فرمانبردار ہیں۔ دوسری طرف روسی اور چینی ہیں جو عسکری قوت رکھنے کے باوجود معاشی ابتری کا شکار ہیں۔ ان چاروں ممالک یعنی جرمنی' جاپان' روس اور چین میں سے کوئی بھی ملک امریکہ کے مقابلے میں بیک وقت عسکری و معاشی طاقت کی اہلیت نہیں رکھتا بلکہ دنیا کی کوئی بھی مملکت آئندہ چند برسوں تک امریکہ کے ہم پلہ ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

ایک بات اور قابل غور ہے کہ دنیا کی کوئی بھی مملکت گذشتہ نصف صدی کے دورانئے کے اندر عالمی قیادت کا ریکارڈ نہیں رکھتی۔ امریکہ کو دیگر اقوام کے مقابلے میں جو استثناء حاصل ہے وہ یہ ہے کہ گذشتہ پچاس سے زائد برسوں کے دوران امریکہ ہی وہ واحد قوت رہی ہے جس میں کبھی بھی آمرانہ طرز حکومت یعنی بادشاہت' فوجی حکمران یا ون پارٹی سسٹم کا وجود نہیں رہا اور نہ ہی امریکہ نے کبھی اپنے ہمسایہ ممالک کے کسی حصے پر حکمرانی کا دعویٰ کیا ہے۔

امریکی پالیسی ساز عالمی قیادت کے لئے امریکہ ہی کو واحد طاقت کے طور پر دیکھنے کے لئے اس لئے بھی متمنی ہیں کہ بقول ان کے یہ صرف امریکہ نے نظریہ "کثیر المقاصد اعتمادی روابط" متعارف کرایا۔ یہ نظریہ امریکن ڈپلومیسی کا شاہکار ہے۔ حتیٰ کہ اقوام متحدہ کے ادارے میں بھی بوسنیا اور کشمیر کے معاملات پر انتہا درجے کی کمینگی کا طرز عمل امریکی نظریے کو غلط ثابت کر چکا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں مفادات کی ہوس کا ایسا مظاہرہ کبھی نہیں کیا گیا جیسا کہ اس ادارے نے امریکی بالادستی کو قائم رکھنے کے لئے کیا ہے۔ اب اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس ادارے نے انصاف کے مقدس عمل کو امریکی مفادات کے تحفظ کے لئے پاؤں تلے روند کر رکھ دیا ہے۔

اقوام متحدہ ہی نہیں بلکہ ورلڈ بینک' آئی ایم ایف اور گیٹ جیسے ادارے بھی پوری طرح امریکی مفادات کے پاسبان بن کر رہ گئے ہیں۔ ان اداروں کی تشکیل کا اصل مقصد یہ تھا کہ تجارتی منافع کی خود کارگردش کے ذریعے سرد بازاری کے خاتمے کے ساتھ ساتھ تجارتی خساروں کے ازالے کے لئے مربوط کوششیں کی جائیں لیکن عسکری طاقت کے حصول کے ساتھ امریکہ چاہتا تھا کہ دنیا اسے ایک اقتصادی پاور کے طور پر بھی قبول کرے لہٰذا اس نے ایسا نظام متعارف کروایا جس میں بین الاقوامی کرنسی کی حیثیت ڈالر کو دی گئی تھی۔ اس طرح پوری دنیا کی تجارت کو نہایت ہی ہوشیاری کے ساتھ ڈالر سے منسلک کر دیا گیا۔ بعد ازاں ان اداروں نے امریکی مفادات کے تحفظ کے لئے دوہرا معیار قائم کیا۔ یورپی ممالک کو سرمائے کی فراہمی کے لئے نہایت ہی آسان شرائط مقرر کی گئیں جبکہ تیسری دنیا کے لئے قرضہ کی فراہمی اس شرط کے ساتھ منسلک کر دی گئی کہ وہ اپنی معیشت کو بیرونی اشیاء کے لئے کھلا رکھیں گے۔

امریکیوں نے ایک اور چالاکی یہ کی کہ مشرق وسطیٰ کے تیل پیدا کرنے والے ممالک کو سیاسی دباؤ اور غیر اخلاقی بلیک میلنگ کے ذریعے اس فیصلے پر مجبور کیا کہ وہ تیل کی فروخت سے کمائی ہوئی ۳۱۰ ارب ڈالر سے زائد رقم کو اپنی تحویل میں رکھنے اور اسے قابل منافع کاروبار میں لگانے کے بجائے امریکن بینکوں میں جمع کرا دیں۔ عربوں کی اس دولت کو امریکہ نے عالمی مالیاتی اداروں اور امریکی اقتصادی امداد کے ذریعے تیسری دنیا کے ممالک کو سود کی نہایت ہی بلند شرح اور کڑی شرائط کے ساتھ قرض کے طور پر دے کر ہمیشہ کے لئے اپنا دست نگر بنا دیا۔ امریکیوں کی اس ظالمانہ پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۸۰ء کی دہائی کے آغاز ہی میں تیسری دنیا کے تیل نہ پیدا کرنے والے ممالک پر قرض کا بوجھ پانچ گنا ہو کر ۶۲ ارب ڈالر تک پہنچ گیا۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ سود کی بلند شرح نے اصل رقم کو ریاضی کے قاعدے x^2 کے تحت ضرب دینی شروع کی تو برازیل' میکسیکو اور پیرو جیسے ممالک اقتصادی طور پر بالکل دیوالیہ ہو کر رہ گئے۔ ان کے لئے سود تو درکنار اتنی رقم بھی نہ تھی کہ اپنے ملک کے ملازمین کی تنخواہوں کی ہی ادائیگی کر سکیں۔ ناقابل وصول قرضوں کے بڑھتے ہوئے حجم نے امریکیوں کو پریشان کر دیا۔ امریکی ان قرضوں پر بطور سود ملنے والی رقم کو

اپنی معاشی حالت کی بہتری کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے خوابوں کی تعبیر معدوم ہوتی دکھائی دینے لگی۔ اس غیر متوقع صورتحال کے باعث امریکیوں نے عالمی مالیاتی اداروں کی تشکیل نو کی ضرورت محسوس کی اور ایسے اقدامات کئے کہ واجب الادا قرضوں کو مع سود پوری ضمانت کے ساتھ وصول کیا جاسکے۔ چنانچہ امریکی ماہرین اقتصادیات نے خاص طور پر آئی ایم ایف کے لئے حکمت عملی میں ایک نوزائیدہ اصطلاح Adjustment Structural کی بذریعہ معاشی دباؤ کی ضرورت عمل نفاذ پر بہت زیادہ زور دیا گیا تھا۔ چنانچہ بنیادی اصلاحات کے طویل المدت پروگرام تیسری دنیا کے ممالک پر ٹھونسنا شروع کر دیئے گئے۔ اس پروگرام کے تحت مالیاتی اداروں نے ترقی پذیر ممالک پر دباؤ ڈالا کہ

☆ وہ سرکاری شعبے میں کئے جانے والے کاروبار سے دستبردار ہو کر نج کاری کی پالیسی اپنائیں۔

☆ افلاس زدہ اور مفلوک الحال افراد کی صحت' سماجی بہبود اور کمیونٹی ویلفیئر کے لئے مختص کی جانے والی وفاقی بجٹ کی رقم کی ترسیل فوری طور پر بند کر دی جائے۔

☆ غذائی پیداواری فصلوں کی جگہ نقد آور فصلوں پر توجہ دے کر پیداوار برآمد کی جائے۔ اندرون ملک غذائی اور گھریلو استعمال کی عام اشیاء پر حکومتی رعایت ختم کر کے تجارتی بنیادوں پر قیمتیں مقرر کی جائیں تاکہ قرضوں کی ادائیگی کے لئے رقوم کا بندوبست ہو سکے۔

☆ سرکاری ملازمین بشمول پولیس' فوج اور دیگر سیکورٹی ایجنسیوں کے تعدادی ڈھانچے' تنخواہوں' پنشن اور مدت ملازمت پر نظرثانی کر کے مختص شدہ رقوم کی مقدار کم کر دی جائے۔

☆ مواصلات اور توانائی کے شعبوں میں کسی رو رعایت کے بغیر ایسا نظام نافذ کیا جائے کہ ان شعبوں سے متعلقہ ادارے خالص تجارتی بنیادوں پر نفع حاصل کر سکیں۔

امریکہ کے اقتصادی مفادات کا تحفظ کرنے والے اداروں کی مندرجہ بالا سفارشات کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کینیا میں تعلیمی نظام تباہ و برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ کمیونٹی ویلفیئر پر خرچ کی جانے والے رقوم کو قرضوں کی ادائیگی اور دیگر اہم مصارف میں استعمال کرنے کے لئے عالمی بینک نے کینیا کی حکومت پر دباؤ ڈالا کہ مفت تعلیم کی سہولت ختم کر کے فیسوں کی وصولی کا طریقہ کار شروع کیا جائے۔ اب اوسطاً ۳۵۰ ڈالر سالانہ آمدنی کے حامل کینیائی باشندوں کے لئے پرائمری تعلیم کی ۴۴ ڈالر ماہانہ اور سیکنڈری درجات کی تعلیم کے لئے ۱۸۰ ڈالر ماہانہ فیس مقرر کر دی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ فیس کی یہ رقم کینیا کی آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کی استطاعت سے باہر ہے۔

ویلنزویلا میں آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی سفارشات کی روشنی میں دفاعی بجٹ میں کمی کا فیصلہ کیا گیا تو فوج میں بے چینی پھیل گئی۔ تشدد کے ذریعے حکومت کا تختہ الٹنے کی دو ناکام کوششیں کی گئیں۔ روز مرہ اشیاء کی قیمتوں میں اضافے نے داخلی صورتحال کو اور بھی خراب کر دیا اور خونین فسادات شروع ہو گئے۔ جانی اور مالی نقصانات کے باعث ویلنزویلا کی معیشت کی گاڑی پٹڑی سے ایسی اتری کہ طویل عرصے تک بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

فلپائن میں ان اداروں نے حکومت کو تجویز دی کہ نقد آور فصلیں پیدا کر کے زرمبادلہ کمایا جائے تاکہ قرضوں کی ادائیگی کا توازن بہتر ہو سکے۔ چنانچہ غذائی ضرورت کی فصلوں کے بجائے نقد آور فصلوں پر توجہ دی گئی۔ ان حالات میں غذائی خود کفالت کی جانب گامزن فلپائن اپنے عوام کی بنیادی غذائی ضروریات پورا کرنے کے لئے غیر ملک سے غذائی اجناس کی درآمد پر مجبور ہوتا جا رہا ہے۔

براعظم افریقہ کا ملک زمبابوے پورے علاقے میں صحت کی سہولتوں کے اعتبار سے اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ عالمی مالیاتی اداروں نے حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ صحت کے لئے مختص بجٹ میں تیس فیصد کمی کر دے۔ طبی عملے کی تعداد میں کمی کی جائے۔ دواؤں کی مفت فراہمی کا سلسلہ بند کیا جائے اور ہسپتالوں میں فیس کا نظام اپنایا جائے تاکہ اخراجات حاصل ہو سکیں۔ ان اقدامات کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس طرح جو رقم حاصل ہو گی اسے قرضوں کی واپسی کی مد میں استعمال کیا جا سکے گا۔ حکومت نے مالیاتی اداروں کے مشورے پر عمل کیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو ماہ کے اندر اندر صرف دارالحکومت ہرارے میں دوران ولادت ہلاک ہونے والے بچوں اور ماؤں کی تعداد دوگنی ہو گئی کیونکہ طبی سہولتوں سے فائدہ اٹھانا اب ہر ایک کے لئے ممکن نہیں رہا۔

ارجنٹائن میں ان عالمی مالیاتی اداروں نے حکومت کو سفارشات پیش کیں کہ پنشن کی رقم کو نصف کر دیا جائے چنانچہ پنشن یافتہ ضعیف افراد فاقہ کشی کا شکار ہونا شروع ہو گئے اور افلاس کے ہاتھوں خودکشی کرنے والے ضعیف افراد کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہو گیا۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو ہماری اقتصادی پالیسی بھی دیگر ترقی پذیر ممالک کی طرح امریکی مفادات کا تحفظ کرنے والے اداروں یعنی آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے تابع ہے۔ پاکستانی حکومت نے ۱۹۸۸ء میں آئی ایم ایف کا بنیادی اصلاح والا پروگرام قبول کیا تھا۔ اسی ادارے نے پاکستان کے بارے میں اپنی رپورٹ تیار کی جس میں بتایا گیا کہ ہمارا اقتصادی پروگرام ویران ہونے کے قریب ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ ۸۰ کروڑ ڈالر کے قرضوں کی قسطیں ادا کرنے کے لئے ہمارے زرمبادلہ کے ذخائر میں صرف ۲۰ کروڑ ڈالر کی رقم موجود ہے۔ حکومتی اداروں کی تحقیق کے مطابق پاکستان میں قومی پیداوار میں ترقی کی شرح کا ۶ فی صد سالانہ ہے لیکن آئی ایم ایف کے ماہرین نے تمام اعداد و شمار کو رد کرتے ہوئے ہمیں بتایا کہ پاکستان میں افراط زر کی شرح ۴ کی بجائے ۱۰ فیصد سالانہ ہے اور قومی پیداوار میں صرف ۳ فیصد ترقی ہو رہی ہے۔ اس ادارے نے پاکستان کے مضبوط اقتصادی ڈھانچے پر تعمیر ہونے والی شاندار عمارت کو ڈھانے کے لئے بنیادوں پر ضرب لگانے کا فیصلہ کیا اور اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ کے نام سے بنیادی اصلاحات رائج کرنے پر زور دیا تاکہ قرضوں کی واپسی کی ضمانت مہیا ہو سکے۔ بنیادی اصلاحات کے پروگرام کو مہمیز امریکہ ہی سے درآمد شدہ وزیراعظم معین قریشی کے دور میں لگی۔

آئی ایم ایف کی غلامی کرنے سے ملک کا اچھا خاصا اقتصادی نظام برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ اقتصادی ترقی کی شرح بتدریج کم ہو رہی ہے اور افراط زر میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بیروزگاری کا عفریب پورے ملک پر چھا گیا ہے۔ ادائیگیوں کے توازن اور بجٹ کے خسارے کی صورتحال میں بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑ سکا۔ آئی ایم ایف کے مشورے پر عمل کر کے روپے کی قدر کو اتنا کم کر دیا گیا ہے کہ مقامی سرمایہ کار مایوسی کا شکار ہو گئے ہیں۔ روز مرہ کی اشیائے استعمال کی قیمت عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔ نقد آور فصلوں کی کاشت میں اضافے نے غذائی اجناس کی

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

جاتے جاتے وہ مجھے ایک اور داغِ حسرت دے گئے

مولانا قاری سعید الرحمٰن علوی اللہ کو پیارے ہوئے

وہ سینہ چاک سینہ چاکانِ چمن سے آملنے کی تیاری کر رہا تھا

اقتدار احمد

مجھے تو "بیادِ رفتگاں" لکھنے کی ذرا بھی مشق نہیں لیکن دیکھتا ہوں کہ کسی بھی میدان کا کوئی نمایاں مرد اپنی مہلت عمر کے پورا ہو جانے پر جب اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کرتا ہے تو اگلے چند ہفتوں میں اور پھر گاہے گاہے اس کے حلقۂ احباب سے تعلق رکھنے والوں کی تحریروں کا تانتا سا بندھ جاتا ہے جن میں اس کی بے وقت موت کے ماتم کے علاوہ مرحوم کے محاسن کا بیان ہوتا ہے اور پھر یہ بھی کہ جانے والا جو خلاء چھوڑ گیا ہے' وہ کبھی پُر نہ ہو سکے گا۔ "بے وقت موت" ایک مسلمان کے نزدیک کلمۂ کفر ہے کیونکہ قضا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ وقت سے پہلے کبھی نہیں آتی اور کسی بھی شخص کے جانے سے فوری طور پر ایک خلاء تو واقعی پیدا ہو جاتا ہے لیکن وقت کے بہتے دریا کی روانی میں اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ یوں نہ ہوتا تو کارخانۂ قدرت میں اب تک کام ٹھپ نہ ہو چکا ہوتا؟۔ "موت سے کس کو رُستگاری ہے' آج وہ کل ہماری باری ہے"۔ رہا محاسن کا تذکرہ تو یقیناً نبی اکرم ﷺ کی ہدایت ہمیں یہی پہنچی ہے کہ اپنے مرنے والوں کی خوبیوں کا ذکر کیا کرو' ان کی خطاؤں کا معاملہ ربِ کریم پر چھوڑ دو تاہم خوبیوں کے بیان میں مبالغہ آرائی بلکہ غلط بیانی تک کی بھی گنجائش تو ہرگز نہیں۔

ایک بزرگ سے کچھ عرصہ نیاز مندی کا تعلق رہا۔ مختصر ملاقاتیں بھی رہیں اور طویل نشستیں بھی۔ دنیا کے ہر موضوع پر گفتگو ہوئی' تبادلۂ خیال کے کتنے ہی مواقع ملے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لین دین کے معاملات کی نوبت بھی آ گئی بلکہ ان میں باہم دگر شکایات بھی پیدا ہوئیں۔ اسی اثناء میں انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا تو ظاہر ہے کہ دل کو ٹھیس لگی' دکھ ہوا اور میں انہیں یاد کر کر کے ان کے حق میں مغفرت کی مسنون و ماثور دعائیں بھی کرتا رہا لیکن اب جو ان کی یاد میں شائع ہونے والے مضامین پڑھے تو معلوم ہوا کہ وہ تو بڑے ہی پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ ان کی بذلہ سنجی کو بارہا پھکڑ بازی میں بدلتے دیکھا لیکن پتہ چلا کہ ان کی زبان سے تو بصائر و عبر کے سوا کبھی کچھ نکلتا ہی نہ تھا۔ زندگی بسر کرنے کے لئے مادی وسائل انہیں بھی درکار تھے اور تجربہ ہوا تھا کہ بسا اوقات ان کی طلب میں وہ دنیا داروں کی طمع کو بھی پیچھے چھوڑ گئے' اب انکشاف ہوا کہ دنیا اور متاعِ دنیا سے ان کی بے نیازی فقرِ پوزری کو چھوتی رہی ہے' وغیرہ۔۔۔ اس ذاتی تجربے کے بعد "بیادِ رفتگاں" سے وحشت سی ہونے لگی ہے بایں ہمہ مولانا سعید الرحمٰن علوی کی یاد میں کچھ لکھنے پر مجبور ہو گیا ہوں جو انہی دنوں ہم سے جدا ہو کر اللہ کی رحمت میں چلے گئے ہیں۔ ہم سب کی منزل وہی ایک ہے' وہ آگے نکل گئے اور ہم ابھی لائن میں لگے ہوئے ہیں۔ "بہت آگے گئے' باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں"۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ مرحوم کو ان رجالِ دین میں سے پایا تھا جن کی طرح کے لوگ ہمارے معاشرے میں اب چراغِ رخِ زیبا لے کر ڈھونڈے بھی مشکل سے ملتے ہیں۔ قحط الرجال کے اس دور میں ان کا دم غنیمت تھا۔ ان کی خوبیاں یاد آتی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ ضرور شرف قبولیت بخشے گا تو کچھ بشری کمزوریاں بھی مشاہدے میں آئی تھیں جو رب رحیم معاف فرما دے۔ کون ہے جو اللہ کی طرف سے مغفرت کا محتاج نہیں' اللہ کا وہ بندہ بھی اس کی رحمت کا امیدوار ہے اور مجھ سمیت اس کے ہر جاننے والے پر خلوصِ دل سے اس کے حق میں دعا واجب ہے۔

میں خود ان کے وسیع تر حلقہ احباب میں تو ضرور شامل تھا لیکن انہیں اپنا بزرگ سمجھتا تھا البتہ وہ جب بھی ملے' بے تکلف دوست کی طرح پیش آئے بلکہ کبھی تو یہ بھی محسوس ہوا کہ وہ الٹا میرا اکرام کر رہے ہیں۔ میں علم و فضل' لکھنے بولنے کی صلاحیت' وسعتِ مطالعہ اور سیاسی امور کے ادراک بالخصوص مذہبی و دینی سیاست کی بوقلمونی کے عملی تجربے کے اعتبار سے ان کی ہم نشینی کا کیا' آس پاس پھٹک سکنے تک کا دعویدار نہیں رہا۔ اس کے باوجود وہ مجھے کسی شمار قطار میں سمجھتے تھے تو یہ ان کی اعلیٰ ظرفی تھی۔ ایک اور پہلو سے دیکھوں تو ان کی عظمت کا نقش دل پر گہرا ہو جاتا ہے۔ ان کی زندگی فقر و فاقہ میں تو نہیں گزری لیکن ہاتھ کھلا بھی کہاں رہا ہو گا اور دوسری طرف مجھ پر اللہ کا خاص کرم رہا کہ اب بہت دنوں سے تنگ دستی نہیں دیکھی۔ (ویسے دونوں ہی حالتیں ابتلاء و آزمائش کی مختلف صورتیں ہیں اور اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کو ان میں سے سرخرو نکالے)۔ مرحوم کو میری مقدرت و استطاعت صاف نظر آتی تھی لیکن میں گواہی دیتا ہوں کہ کبھی اشارے کنائے میں بھی کسی بہانے مجھ سے ایک پیسے کی امید کا اظہار نہ ہونے دیا کسی اور کا تجربہ کچھ مختلف ہو تو ہو' میں ان کی غیرتِ فقر کا عینی شاہد ہوں۔

کئی برسوں پر محیط اپنی زندگی کے آخری دور میں مجھ سے تعلق کے دوران محض دو بار وہ کوئی غرض لے کر ملنے آئے۔ ایک دفعہ ایک پریشان حال شخص کی ایسی ملازمت کے لئے سفارش کے ساتھ جو اس وقت میری ضرورت بھی تھی اور ایک بار اس مدرسے کی تعمیر میں متعین اور بہت محدود تعاون کی درخواست

کے ساتھ مدرسے کے مہتمم صاحب کی رفاقت میں جس سے ان کا آخر دم تک تعلق رہا۔ اللہ کے اس بندے نے کبھی ایک دُھیلی کا قرض بھی تو نہ مانگا جس کے مطالبات مجھے خود سے متعلق ہر حلقے سے اس کثرت کے ساتھ موصول ہوئے اور بھگتانے پڑے کہ اب اس حسنِ سلوک پر طبیعت کم کم آمادہ ہوتی ہے جس میں انجام کار نیکی برباد اور گناہ لازم ٹھہرتا ہے۔ اللہ معاف کرے' جس "قرضِ حسن" کی لذت کو علامہ اقبالؒ نے سودی لین دین کی لعنت کے مقابلے میں نمایاں کیا ہے' اس کا ذائقہ ہمارے زمانے میں بہت سی کڑوا کسیلا ہوگیا ہے۔ یہ طرفین کی نیتوں کے فتور کا نتیجہ ہوگا لیکن بہرصورت حقیقت یہ ہے کہ بحالاتِ موجودہ قرض طلب کرنے والے کو آدمی حسبِ استطاعت کچھ ہدیہ ہی پیش کردے تو عافیت میں رہتا ہے' جان کو روگ تو نہیں لگتا۔

مولانا علوی شعلہ بیان خطیب رہے ہوں گے۔ محض اتفاق ہے کہ ان کا یہ رنگ کبھی چشم سر سے دیکھا تو نہیں لیکن خوب اندازہ ہے اور اپنے اندازے پر اعتماد بھی رکھتا ہوں کہ یہ صلاحیت بدرجۂ اتم ان میں موجود ہوگی۔ جن بزرگوں کی انہوں نے جوتیاں سیدھی کیں' وہ سب اس میدان کے شہسوار تھے البتہ تحریر میں ان کی بے ساختگی اور روانی میری بھی دیکھی بھالی ہے۔ میرے مرحوم جریدے "ندا" کے لئے رضاکارانہ جو کچھ لکھ کر لاتے اس کے تیور بتایا کرتے تھے کہ قلم نے قرطاس کی جائے نماز پر ایک ہی سجدے میں یہ پوری تسبیح پڑھی ہے۔ پختہ خط میں لکھی ہوئی ان تحریروں میں کوئی ایک لفظ بھی کٹا پھٹا نہ ملتا' کسی اصلاح کی ضرورت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

ذاتی تعلق کے ابتدائی دور میں ان کی گفتگو بھی مزاحیہ تھی۔ کھلے کھلے سے ہوتے اور ثقہ لیکن شگفتہ باتیں کرتے۔ آخری زمانے میں بجھے بجھے رہنے لگے تھے۔ پاکستان کے حالات سے بہت مایوسی کا اظہار کرتے اور اپنی صحت کی طرف سے فکر مندی کا بھی۔ دل شکستگی کے اس عالم میں آتے اور بہت کم بولتے' اکثر سر جھکا کر آہ سی بھرتے اور اداس کر جایا کرتے تھے۔ میں اپنی جگہ یاس و قنوطیت کا مارا' نتیجہ یہی ہوتا کہ۔

ان کا ملنا خوشی کی بات سہی
ان سے مل کر اداس رہتا ہوں

ایک بار میں نے ان کے چند نامعقول ہم جلیسوں کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ ان لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا آپ کیسے گوارا کرتے ہیں تو بولے کہ کچھ لوگ انگلی پکڑتے ہی پہنچے تک آ جاتے ہیں ان سے جان چھڑانے کے لئے جو بے مروتی درکار ہے' وہ کہاں سے لاؤں؟

وہ تنظیم اسلامی میں باقاعدہ شامل بھی ہوئے اور چندے ماہنامہ "میثاق" کے ادارتی معاون بھی رہے۔ "خدام الدین" کی ایڈیٹری کرچکے تھے لہٰذا "میثاق" کا پیٹ بھرنا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا تاہم دایاں ہاتھ امیر تنظیم' برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے ہاتھ میں دے کر بیعتِ سمع و طاعت فی المعروف کوئی خالہ جی کا گھر نہ تھی۔ علماء کے طبقے سے تعلق اور مجلسِ احرارِ اسلام کی ذہنی رفاقت کا پس منظر رکھنے والے سعید الرحمٰن علوی نے یہ کڑا مرحلہ سوچ سمجھ کر پوری دلی آمادگی کے ساتھ طے کیا تھا لیکن پھر پسپائی اختیار کی تو وہ ہمارے ذہنوں میں کئی سوال کلبلاتے چھوڑ گئے۔ کئی بار جی چاہا کہ اس موضوع پر ان سے بات کی جائے لیکن ہمت نہ ہوئی۔ وہ کوئی علمی بحث چھیڑ دیتے تو میرے مبلغِ علم کا پول کھل جاتا اور اگر مسئلہ ذاتیات کا ہوتا تو اس میں بھی میری پوزیشن بہت نازک تھی۔

یہ تو میری کمزوری ہی تھی کہ ان سے ذاتی تعلق کو تنظیمی رشتے پر فوقیت دی اور یہ رویہ اپنائے رکھا کہ "انیس' ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو"۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ تنظیم سے ان کے "انتقال" پر بھی کچھ ویسا ہی ملال تھا جیسا اب ان کے سفرِ آخرت پر نکل جانے سے محسوس ہو رہا ہے لیکن انیسویں سالانہ اجتماع کے افتتاحی خطاب جمعہ میں ان کی وفاتِ حسرت آیات کی خبر دینے اور طویل و مخصوص اجتماعی دعائے مغفرت کروانے کے ساتھ جب برادر محترم نے یہ انکشاف بھی کیا کہ وہ سینہ چاک پھر سے سینہ چاکانِ چمن سے آ ملنے کے لئے پر تول رہا تھا اور آخری ملاقات میں مولانا علوی ان سے تنظیم کا بنیادی لٹریچر ایک نئے عزم کے ساتھ دوبارہ مطالعہ کے لئے لے گئے تھے' تو دل میں ٹھنڈ سی پڑ گئی ہے۔ میں نے خود بھی اسی کے آثار ان میں دیکھے تھے چنانچہ وثوق کے ساتھ یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ وہ راہِ حق کے اسی قافلے کے راہرو کی حیثیت سے اپنی منزل سے ہمکنار ہوئے ہیں جس کے گرتے پڑتے رفیقِ سفر ہم بھی ہیں۔

جاتے جاتے علوی صاحب داغِ مفارقت کے علاوہ مجھے اس سے کہیں زیادہ گہرا گھاؤ ایک اور دے گئے ہیں۔ یہ داغ حسرت تھا اور اُن کے جانے سے اب دل پر زخم کاری بن گیا ہے جس کی دکھن بڑھتی ہی چلی جائے گی۔ اس کا مرہم جہاں سے ملتا تھا' وہ دکان اپنی بڑھا گئے ہیں۔ پس منظر اس کا یہ ہے کہ قرآن مجید سے علمی و فکری تعلق کا اپنا حدود اربعہ تو محدود اور بس واجبی ہے' اللہ کے کلام سے جذباتی وابستگی میں بحمد اللہ کمی نہیں اور "یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر"۔ اور ہاں' اس کی اچھی قراءت بھی مجھ پر جادو کا سا اثر کرتی ہے۔ عربی کی تھوڑی سی شُد بُد ہے جس کے باعث آواز میں مفہوم کی مناسبت سے اتار چڑھاؤ پیدا کرنے کی اہلیت رکھنے والے قاریوں کو سن کر جھوم جاتا ہوں' لرز اٹھتا ہوں اور گریہ بھی طاری ہو جاتا ہے۔

اب یہ حادثہ گزرا بھی تازہ تازہ ہے کہ گزشتہ ماہِ رمضان المبارک کی آخری تین راتوں میں ترجمۂ قرآن کی تکمیل کے بعد برادر محترم نے قرآن اکیڈمی کی مسجد میں ختمِ قرآن کا اہتمام کیا (جو شبینہ کے نام سے ہمارے ہاں معروف ہے) اور اس کے لئے کئی اچھے پڑھنے والوں کو بطورِ خاص زحمت دی تھی۔ میں رمضان المبارک کی راتوں کے اس پروگرام میں محض جزوی شرکت کر سکا کیونکہ علیل تھا اور اپنے ٹی بی کے مرض کا علاج کرا رہا تھا۔ ان تین راتوں میں بھی وہی معمول برقرار تھا کہ ایک شب معلوم ہوا کہ سعید الرحمٰن علوی بھی متوقع تو ہیں لیکن ان کی طرف سے توثیق موصول نہیں ہو رہی۔ اگر تعین کے ساتھ پتہ چل جاتا کہ آ رہے ہیں اور فلاں وقت پہنچیں گے تو میں درمیان میں آرام لے کر تراویح میں پھر سے شریک ہو جاتا۔ ہائے ری قسمت' غیر یقینی کیفیت چلتی رہی اور میں گھر آ کر بستر میں دراز ہو گیا۔

میری روانگی کے بعد علوی صاحب تشریف لے آئے اور ایک ایک رکعت میں قرآن مجید کے اتنے اتنے طویل حصے پڑھ کر سنائے جو بظاہر ان کی کمزور صحت کے لئے ناقابلِ برداشت بوجھ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس شب نہ جانے ان کے جسم کو قوتِ ایمانی نے فولاد میں ڈھال دیا تھا یا کیا کہ سننے والوں کی ٹانگوں پر بھی جذب و مستی کے خول چڑھ گئے اور وہ تھکنا بھول گئیں۔ اس شب ان کی قراءت کی کیفیت جو سننے میں آئی اسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ "وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی' عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی"۔ علوی صاحب نے جامع القرآن پر زلزلہ طاری کر دیا تھا۔

دوستوں نے اس سماں کو بیان کرنے کی کوشش

میں بتایا کہ معجز نما کلامِ ربانی کے مضامین کے جاہ و جلال نے علوی صاحب کی آواز میں بجلیاں بھر دی تھیں۔ ایک کمزور جسم سے اتنی توانا آواز کا نکلنا ناقابلِ تصور تھا لیکن درجنوں نمازیوں نے اس کا تجربہ کیا۔ آواز کے زیر و بم کا ساتھ علوی صاحب کے جسم نے جس طرح دیا اس کا نقشہ بھی دیکھنے والوں نے کھینچنے کی کوشش کی تھی۔ میں کیا کہوں' آنکھوں دیکھا ہی نہیں۔ کہتے ہیں کہ آواز میں کڑک کے ساتھ پورا تن بھی اکڑ جاتا' ایڑیاں اُٹھ جاتیں اور یوں لگتا جیسے وہ ابھی کسی پر جھپٹنے والے ہیں۔ اللہ کا کلام صرف ان کے گلے سے نہیں' جسم و جاں کی کل کائنات سے نکلتا اور بلند ہوتا محسوس ہوا۔ میں نے اگلے دن یہ تفصیل سنی تو دل مسوس کر رہ گیا۔ عزیزم آصف حمید سے بھرائی آواز میں گلہ کیا کہ بھلے آدمی! تم دنیا جہان کی ریکارڈنگ کا اہتمام کرتے ہو' یہ خیال کیوں نہ آیا کہ بھاگ کے جا کر اس کی آڈیو ریکارڈنگ کا انتظام کر لوں۔ ان چند رکعتوں میں علوی صاحب کی قراءت کے سوا وقفہ تھا ہی کل کتنا' بعد میں اس کی نئی تدوین بھی ہو سکتی تھی۔ بڑی دیر کفِ افسوس ملتا رہا' اب پچھتاوے کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ پھر سوچا کہ ان شاء اللہ اگلے سال نہ صرف خود سنوں گا بلکہ ریکارڈ بھی کراؤں گا۔

علوی صاحب! آپ کا سنانا اللہ کو منظور نہ ہوا' خود میں آپ کو تو سننے کے لئے اب ترستا ہی رہوں گا' اگلا ماہِ مبارک زندگی میں آتا بھی ہے کہ نہیں' سو کیا معلوم!۔ رمضان المبارک کا مہینہ تو ابھی بہت دور ہے' کل کی خبر نہیں' پل کی بھی خبر نہیں۔ البتہ عزیزم آصف حمید سے جو پہلے صرف بھتیجے تھے' اب داماد ہو کر گویا بیٹے بھی بن گئے ہیں اور خیر سے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے سمعی و بصری ریکارڈنگ کے اعزازی ناظم بھی ہیں' میرا گلہ برقرار رہے گا۔ بیٹے' تمہیں شاید اپنے چچا کی اس کمزوری کا علم نہیں تھا۔ اندازہ تھا تو بڑی زیادتی کی تم نے!۔OO

نامے میرے نام . . .

۷ / جنوری ۱۹۸۳ء کو مجھے راحت وولن ملز لیمٹڈ پشاور روڈ راولپنڈی کی جامع مسجد میں جمعہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ نمازِ جمعہ کے بعد خطیب محترم نے ارشاد فرمایا کہ جناب نذر الحق لون صاحب چند منٹوں کے لئے حاضرین کی خدمت میں کچھ گزارش کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر جناب نذر الحق صاحب لون کھڑے ہو گئے پہلے تو خطبۂ مسنونہ پڑھا پھر سورۃ الاحزاب کی آیت "قولوا قولا سدیدا" تلاوت کی۔ اس کے بعد پہلے تو حاضرین کا اس بات پر شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے گزشتہ جمعہ کو یہ اطلاع ملنے پر کہ ان کی بھانجی کا انتقال ہو گیا ہے نہ صرف مرنے والی کے لئے مغفرت بلکہ سب اہل خاندان کے لئے صبر کی دعا کی۔ اس کے بعد انہوں نے حاضرین کو یہ اندوہناک خبر بھی سنائی کہ اسی دن یعنی ۳۱ / دسمبر کو ہی ساڑھے تین بجے بعد دوپہر ان کی دوسری بھانجی کا بھی انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اس کے بعد انہوں نے قرآنی آیات کی روشنی میں حاضرین کو بتلایا کہ پیدا کرنا' زندہ رکھنا اور مارنا اللہ تعالیٰ کا ذاتی فعل ہے' اس کا وقت خود ذات باری تعالیٰ کا مقرر کردہ ہے جو کہ بقول قرآن مجید نہ یہ کہ ایک لمحہ آگے یا پیچھے ہو سکتا ہے بلکہ اگر کوئی قلعہ بند ہو کر بھی اس سے بچنا چاہے تو نہیں بچ سکتا۔ اللہ تعالیٰ خالق و مالک ہونے کے علاوہ اپنے بندوں پر انتہائی حد تک رحیم و کریم بھی ہے' اس لئے اس کے کسی فعل پر عدم اطمینان کا اظہار' ایمان کے لئے زہر قاتل ثابت ہو سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہم اس کی رضا میں راضی ہیں اور ہماری رضا دل کی تنگی سے نہیں بلکہ اس کو مالک حقیقی سمجھنے کے ناطے سے ہے۔ انہوں نے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جو اس نے لیا ہے وہ تو اس کا تھا ہی۔ جو ہمارے پاس ہے وہ بھی اسی کا ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم اپنے سب بھائیوں کی ان دعاؤں کے محتاج ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں کسی ایسے قول یا فعل سے بچائے جو کہ اس کی ناراضگی یا ناپسندیدگی کا باعث بن سکتا ہو۔ آمین۔

اس کے بعد انہوں نے قرآن پاک کی وہ آیت تلاوت کی جس کا ترجمہ یہ تھا کہ ہو سکتا ہے تم کسی چیز کو پسند کرو مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ تمہارے لئے نقصان دہ (شر) ہو اور کسی چیز سے تم کراہت کرو یا ناپسند کرو مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ تمہارے لئے بہتر (خیر) ہو۔ انہوں نے اگلی بات کرنے سے پہلے کہا کہ ماسوائے اس عورت کے جس کا خاوند فوت ہو جائے مسلمانوں کو سوگ کی اجازت تین دن تک ہے۔ پھر انہوں نے بتلایا کہ میرے لڑکے مظہر الحق لون کا نکاح عزیزی آمنہ لون کے ساتھ تیس دسمبر ۱۹۸۲ء بروز جمعرات بعد از نماز ظہر جامعہ اشرفیہ' فیروز پور روڈ' لاہور میں ہوا تھا' جس کا ولیمہ وہ آج اور اسی وقت کرنا چاہتے ہیں اس سلسلہ میں انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے احکامات کی روشنی میں بتلایا کہ ولیمہ دراصل نکاح کا اعلان ہے۔ اس کی دعوت کرنا سنت ہے۔ اور اس دعوت کا' اگر کوئی عذر شرعی مانع نہ ہو تو قبول کرنا واجب ہے۔ جس ولیمہ کی دعوت میں امیروں کو بلایا اور غریبوں کو چھوڑا جائے بقول نبی اکرم ﷺ "وہ شرالطعام یعنی برا کھانا ہے۔ دعوت کا نام و نمود' ریا اور منافقت وغیرہ سے پاک ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ولیمہ کے بارے میں بتایا کہ حضرت صفیہؓ کا ولیمہ ملیدہ کھلا کر' کچھ ازواج مطہراتؓ کا ولیمہ دو مُدّ جو سے اور حضرت زینبؓ کا ولیمہ کھانے کی دعوت دے کر کیا گیا تھا۔ اس سے انہوں نے یہ استدلال کیا کہ نبی اکرم ﷺ نے ہمارے لئے ایک ایسا نمونہ چھوڑا ہے کہ ہمارا کوئی غریب سے غریب بھائی اگر دعوت ولیمہ دے کر اوپر کی شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے خلوص سے صرف سادہ پانی بھی پیش کر دے تو سنت پر عمل کرنے کا ثواب پا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے دعوت ولیمہ پر اوپر والی شرائط کے تحت استطاعت کے مطابق خرچ کرنے کی اجازت دی ہے اور بعض روایات کے مطابق دعوت ولیمہ میں گوشت کے شوربے کی پسندیدگی کا بھی ذکر ہے' مگر استطاعت کی حد جہاں ختم ہوتی ہے اسی مقام سے اسراف کی حد شروع ہو جاتی ہے اور ذرا سی غلطی یا ایمان کی کمزوری بجائے فائدہ کے نقصان کا باعث بنتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں ایک کمزور ترین ایمان والا مسلمان ہوتے ہوئے آسان راستے کو اپنا رہا ہوں اور میرا فعل دین میں کوئی حجت نہیں۔ ہر مسلمان کا حق ہے کہ وہ سنت کی تابعداری جتنے بہتر طریقے سے کر سکے کرے۔ پھر انہوں نے حاضرین مجلس کو دعوت ولیمہ دی اور گزارش کی کہ وہ سنتیں ادا کرنے کے بعد صرف چند منٹوں کے لئے تشریف رکھیں اور دعوت ولیمہ میں شرکت فرما کر مشکور فرمادیں۔

سنتیں ادا کرنے کے بعد ان کے بھانجے (جس کی دونوں بہنیں ایک ہفتہ قبل اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں) اور ان کے بیٹے مظہر الحق لون نے جس کے نکاح کی یہ دعوت ولیمہ تھی' حاضرین کی خدمت میں کھجوریں پیش کیں جو کہ حاضرین نے پر خلوص دعاؤں کے ساتھ قبول کیں۔ اس طرح یہ دعوت ولیمہ اتباع سنت اور دین کی آسانیوں کا ایک نیا راستہ بتلاتے ہوئے چند

منٹوں میں اختتام پذیر ہوئی۔ یہ ایک اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس پر چاہے وہ کرے۔ آمین

والسلام آپ کا مخلص

احسن رشید۔ سینئر انجینئر ۲/۷ ویسٹرج ۱۔ راولپنڈی

☆ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو اتباع سنت کی توفیق سے نوازے۔ اسی کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تنظیم اسلامی کے امیر نے بیس بائیس برس پہلے اپنے گھر سے ہی اس خیرات کو شروع کیا اور اب مسجد میں نکاح، بارات کی نفی، لڑکی والوں کے ہاں تقریب اور دعوت طعام کی عدم موجودگی کے ساتھ دیگر درجنوں رسومات کی جڑ بھی اس حلقے سے اکھڑتی جا رہی ہے جس میں ان کا اور تنظیم اسلامی کا اثر ہے۔۔۔ مدیر

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو!

—— سردار اعوان ——

دنیا کا ہر مسلمان آج یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ ہمارے مسلسل زوال کا آخر سبب کیا ہے؟ کیا یہ ساری ذلت و رسوائی اس لئے ہے کہ دنیا میں ہمارا جاہ و جلال اور شان و شوکت باقی نہیں رہی۔ اس کا جواب ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپؐ کے صحابہؓ کی زندگیوں میں تلاش کرنا ہو گا۔ جب مسجدیں اتنی سادہ تھیں کہ نماز کے لئے آنے والوں کو مسجد میں داخل ہونے کے لئے جوتے باہر اتارنے کی ضرورت نہ تھی۔ (جوتے اتار کر مسجد میں آنے کا مسئلہ بہت بعد میں پیدا ہوا جب مساجد قیمتی قالینوں سے مزین ہونے لگیں۔) ایسے بلند و بالا خوبصورت مینار تھے اور نہ آرائش و زیبائش --- اس دور کے مسلمانوں نے اپنی صلاحیتیں یونانی علوم اور طب کو فروغ دینے یا دنیا پر عربوں کی دھاک بٹھانے کے لئے صرف نہیں کی تھیں۔ ان کا کام اللہ کے دین کو پھیلانا تھا جو دنیا میں امن قائم کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ ان کے پاس ایک ہی طاقت تھی اور وہ طاقت تھی اسلام کی، جس کے سامنے بڑی بڑی سلطنتیں سرنگوں ہوئیں۔ یہ سلطنتیں مال و دولت اور اسباب دنیاوی میں کم نہ تھیں، لیکن ان کا نظام اتنا بوسیدہ اور فرسودہ ہو چکا تھا کہ مسلمان جہاں بھی گئے اسلام کا نظام عدل قائم کرنے میں انہیں کہیں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔

مسلمانوں کا فن مصوری، عمارتوں میں نقش و نگار کا ذوق و شوق، ابن سینا کی طب اور شام کی تلواریں، یہ سب اسلام پر عمل کرنے کے ثمرات تھے نہ کہ اسلام کو پھیلانے کا ذریعہ۔ ٹی۔ بی ارونگ کے مطابق مسلمان حکمرانوں نے سپین میں اپنی عیسائی اور یہودی رعایا کو رومی دور کے بھاری ٹیکسوں سے نجات دلا کر "جزیہ" اور "خراج" لینا شروع کیا جو کسی شخص کی استطاعت اور اصل پیداوار کی بنیاد پر تھے تو ان میں خوشحالی آئی جو علوم و فنون میں ترقی کا باعث بنی ورنہ طارق بن زیاد اپنے ساتھ کوئی "ترقیاتی منصوبے" لے کر سپین میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ ان کے پیش نظر صرف اور صرف اللہ کے دین کو سربلند کرنا تھا۔ لیکن انہی مسلمانوں نے جب دنیاوی زندگی کو مطمع نظر قرار دے کر اسلام سے اپنا رشتہ کمزور کر لیا تو یہ ساری ترقی اور خوشحالی دھری کی دھری رہ گئی۔ ان میں سے کوئی شے انہیں انجام بد سے نہ بچا سکی۔

"اندلس۔ مسلم سپین کے آرٹ" کا نمونہ کے زیر عنوان نیویارک کے میٹروپولیٹن میوزم آف آرٹ میں ۳/جولائی تا ۲۷/ستمبر ۱۹۹۴ء ہونے والی نمائش سے شاید ہم عبرت حاصل کرتے۔ سپین میں اسلام کے داخلے کے وقت صحابہؓ نے مساجد تعمیر کرنے کے لئے کئی باتیں ذہن نشین کرائیں، جو صحیح بخاریؒ میں مذکور ہیں۔ خلیفہ عمر رضی اللہ عنہ نے مسجدیں بنانے کے لئے حکم دیتے ہوئے فرمایا۔ "یہ صرف بارش سے بچانے کے لئے ہوں، انہیں لال پیلے رنگ و روغن کر کے لوگوں کے لئے آزمائش نہ بنا دینا۔" انس رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث کا حصہ پڑھ کر فرمایا۔ "وہ وہاں نماز ادا کرنے کی بجائے مساجد کو اپنی عظمت کی علامت بنا لیں گے" ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا "تم بھی یہودیوں اور عیسائیوں کی نقالی میں مسجدوں کو سجانے لگو گے"۔

سپین میں یہ تبدیلی اس وقت آئی جب آخری اموی خلیفہ کے پوتے عبد الرحمٰن ابن معاویہ کو اپنی ماں کے خاندان میں پناہ طلب کرنا پڑی اور نام نہاد "مشکروں" نے حالات سے فائدہ اٹھا کر ملک پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ چنانچہ وہ صرف نام کے امیر رہ گئے۔ مزید یہ کہ بغداد کی عباسی خلافت سے اپنا تعلق توڑ کر انہوں نے بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تو فرمان ہے کہ جو شخص تم میں سے پھوٹ ڈالنے کے لئے تمہیں مرکز سے ناطہ توڑ لینے کا مشورہ دے، اسے قتل کر دو"۔ (صحیح مسلم)

عبد الرحمٰن نے قرطبہ کو اپنا نیا دارالخلافہ بنایا۔ نیویارک میں ہونے والی اس نمائش سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح انہوں نے یہاں ایک عظیم الشان مسجد کی تعمیر شروع کرائی اور سرکاری سرپرستی میں فنون اور سائنس کی ترویج و ترقی کی داغ بیل ڈالی، جس کی وجہ سے انہیں بڑی شہرت ملی (ٹی۔ بی ارونگ جیسے ان کے مداح آج بھی موجود ہیں۔) لیکن دوسری طرف ان کا سارا انحصار کرائے کے سپاہیوں پر تھا، جن کی اکثریت آزاد کردہ غلاموں پر مشتمل تھی جو سونے چاندی کے بندے تھے اور دین سے انہیں کوئی رغبت نہ تھی۔ چنانچہ ان کے جو جانشین آئے وہ غلاموں کے تاجر اور کفر اور اسلام کے فرق سے نابلد تھے۔ (بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بغداد خود بھی قرطبہ کی طرح ایک کٹھ پتلی کا روپ دھار چکا تھا)۔ تاہم سپین میں کسی نے دو سو سال تک اپنے لئے "خلیفہ" کا نام استعمال نہ کیا۔

عبد الرحمٰن الناصر وہ شخص تھا جس نے بغداد کے خلیفہ اور قاہرہ کے خلیفہ مخالف فاطمیوں کو چیلنج کر کے یہ اہم قدم اٹھایا۔ اس نے قرطبہ سے بالکل باہر ایک نیا شہر آباد کیا اور اس کا نام "مدینۃ الزہرہ" رکھا۔ وہاں اس نے بہترین کاریگر اور ممتاز ترین ماہرین جمع کرائے جو اسے ایک ایسا شہر بسا کر دیں جو صحیح معنوں میں اس منصب کے شایان شان ہو تاکہ وہ دنیا پر دھونس جما سکے کہ "خلیفہ" کہلانے کا حق دار وہ ہے، نہ کہ عراق اور مصر۔

یہ مرض صرف سپین تک محدود نہ تھا۔ بغداد اور قاہرہ کے حکمران اپنی اپنی جگہ الگ الگ مثالی شہر بسانے میں لگے ہوئے تھے۔ چند صدیوں بعد یہی کچھ دہلی اور استنبول کے سلاطین نے کر دکھایا۔ حکمرانی کے یہ انوکھے انداز تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تو یہ تھی کہ مسلمان حکمران کا اصل فرض منصبی اسلام کی نشر و اشاعت اور اس کا نفاذ و قیام ہے لیکن سلطان عبد الرحمٰن الناصر کے دور تک ہوتے ہوتے تصور یہ رہ گیا کہ کامیاب حکمران وہ ہے جو عالیشان محلات اور قلعے تعمیر کرائے، ہیرے جواہرات سے اپنے خزانے بھرے اور تحفے تحائف لیتا دیتا رہے۔ ایک شاعر کی وہ نظم بھی ترجمہ کے ساتھ نمائش میں موجود تھی جس میں بادشاہوں کے ان کمالات کے گن گائے گئے تھے۔

(Curtsey : "Encounter with Islam" - USA, September 1994)

کیا خلافت بھی کوئی بھولی بسری داستان ہے؟

اقتدار احمد

کھنڈر گواہ ہیں کہ عمارت عظیم تھی

وہ بابرکت نظام عمرانی ارتقاء سے استفادہ کیوں نہ کرے جو انسان کا مشترک سرمایہ ہے!

اس حقیقت کا انکار تو اب ڈھٹائی ہی قرار دیا جائے گا کہ "خلافت" کی اصطلاح جو چند برس پہلے بڑی ہی نامانوس لگتی تھی' ایک بار پھر زبان زد خاص و عام ہو گئی ہے اور یہ بھی کہ اب کے اس کا چرچا عالمگیر سطح پر ہوتا سنائی دیتا ہے تاہم وابستہ اس کی یاد سے کچھ تلخیاں بھی ہیں اور اس کا تجربہ انہی لوگوں کو ہوتا ہے جو خلافت کا پیغام عام کرنے اور اس کی نوید سے مردہ دلوں کو زندگی کی حرارت سے آشنا کرنے کے کام پر لگ جاتے ہیں۔

ایک عام دل گرفتہ مسلمان جسے ستم ہائے روزگار نے خود اپنے آپ سے بھی بیگانہ کر دیا ہے' خلافت کو ایک حسین خواب سمجھتا ہے جس کی تعبیر دیکھنا شاید اس کی قسمت میں نہیں۔ نظامِ خلافت کی برکات کا تذکرہ اسے اجنبی نہیں لگتا کیونکہ اس کی یادداشت کے کسی کونے کھدرے میں وہ آج بھی محفوظ ہے۔ اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے یاد ہے سب ذرا ذرا۔ اسے یقین ہے کہ وہ مبارک نظام پھر سے کرۂ ارضی پر یا کم سے کم اس کے اپنے وطن میں قائم ہو جائے تو سارے دِلدّر دُور ہو جائیں گے۔ یہ دنیا مزرعِ آخرت تو بنے ہی گی' زندگی کا یہ دنیوی حصہ بھی حیاتِ ابدی کے لئے عذاب و ثواب کمانے کی جگہ بن جائے گا اور بذاتِ خود عذاب نہیں رہے گا جیسا ان دنوں ہے۔ ان لوگوں کو نظامِ خلافت کے قیام کی امید دلائی جائے اور امید کی شمع فروزاں کرنے والوں کے خلوص پر وہ اعتماد کر سکیں یعنی دل کی آنکھوں سے انہیں نظر آئے کہ خلافت کی منادی کرنے والے بہروپئے' شعبدہ باز اور اپنے مطلب کے یار نہیں ہیں تو وہ خلافت پہ اپنا سب کچھ لٹا دینے کو تیار ہو جائیں گے چاہے ان کی امائیں بھی انہیں یہ کہہ کر رخصت نہ ہوئی ہوں کہ "جان بیٹا خلافت پہ دے دو"۔ تصویر کا ایک رخ یہ ہے اور فی الواقع ہے' نظربندی کا کوئی کمال نہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ بھی بالفعل موجود ہے اور اسے نظرانداز کر دینا اپنے آپ کو فریب دینے کے مترادف ہے۔ چار جماعت پڑھا کوئی بھی مسلمان خلافت کے ذکر پر عجیب و غریب ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ اس نے تاریخ پڑھی نہ فلسفہ تاریخ کی اسے ہوا لگی ہے' قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کا بھی اسے قطعاً کوئی اندازہ نہیں' اور اس بات پر بھی اس نے غور کرنے کی کبھی زحمت نہیں اٹھائی کہ زندہ و پائندہ نظریات کن مراحل سے گزر کر روح سے خالی رسموں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے نہاں خانہ دل میں تو بس واقعات کی کچھ تصویریں آویزاں ہیں' کچھ مناظر حافظے میں پتھر پر لکیروں کی طرح نقش ہو کر رہ گئے ہیں جن کا پس منظر اسے معلوم ہے نہ معلوم کرنے کی کوئی شعوری کوشش اس نے کی ہے۔ اسے آپ خلافت کی خوشخبری دیتے ہیں تو ایک آہ بھر کے رہ جاتا ہے یا زیرِلب مسکرا دیتا ہے جیسے زبان حال سے کہہ رہا ہو کہ "اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!" یا پھر زیادہ ہی جری ہو تو ایک خندۂ استہزا سے آپ کے حوصلے پر حملہ آور ہوتا ہے۔ آپ ہمت کریں اور کرید کر دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ دو "حقائق" پر اسے یقین کے درجے کا ایمان حاصل ہے اور اسی یقین نے اس کی سوچ اور رویئے کو وہ شکل دی ہے جو آپ کو بالکل پسند نہیں آئی۔

پہلی "حقیقت" یہ کہ اسلام کا سنہری دور یعنی خلافت راشدہ کا وہ بابرکت و مسعود نظام جس کے آپ گن گاتے ہیں چلا ہی کتنے برس؟ تیس بتیس برسوں سے زیادہ تو نہیں جس کے بعد ملوکیت نے اس پر شب خون مارا اور اس نظام کو یوں ملیامیٹ کر کے رکھ دیا کہ اب اس کا ذکر ہی کیا جا سکتا ہے اور وہ بھی اس انداز میں کہ "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا' جو سنا افسانہ تھا"۔ جس نظام کو وہ نفوس قدسیہ نہ چلا سکے جو نسل انسانی کا مکھن تھے' اسے آپ اس دور زوال میں چلائیں گے "جب گھٹ گئے انسان' بڑھ گئے سائے!"۔ اور دوسری "حقیقت" یہ کہ جس خلافت کا رونا آپ روتے ہیں' رواں صدی میں بقول آپ کے ترک ناداں نے جس کی قبا چاک کر کے اپنوں کے ساتھ وہ نادانی کی جو غیروں کی عیاری نہ کر پائی تھی' وہ تو بدترین جبر و استبداد کا تسلسل تھا۔ ایک اندھیر تھا جو یورپ کی طرف سے پھوٹی روشنی کے سامنے ٹھہر ہی نہ سکتا تھا۔ سلطانیٔ جمہور کے اس زمانے میں شاہی درباروں کی رسم و راہ کا کیا کام!۔ یورپ کا مردِ بیمار بدعنوانی کے سرطان کے ہاتھوں موت سے ہمکنار ہو کر گہرا دفن کیا جا چکا ہے۔ خلافت کے ادارے کو اس نے ایک گالی بنا دیا تھا' خدارا اہم پڑھے لکھے لوگوں سے شائستہ گفتگو کیجئے' گالی تو نہ دیجئے۔

پہلی حقیقت کا پردہ چاک کرنے کے لئے دلائل اور تاریخی شواہد کے ڈھیر لگائے جا سکتے ہیں کہ دور خلافت راشدہ کی برکات صدیوں اپنے اثرات کی جھلک دکھاتی رہی ہیں اور کسی نہ کسی طور یہ کام ہوتا بھی آیا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ معذرت خواہانہ انداز میں ہوا لہٰذا سوچنے سمجھنے والوں کو مطمئن نہیں کر سکا۔ اللہ بھلا کرے میرے برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا جنہوں نے پہلی بار اس سلسلے میں ایک نہایت خوبصورت بات کہی۔ میں تو بھائی ہونے کے ناطے ان کے لئے ویسے بھی نیک جذبات رکھتا ہوں' لیکن یہ تحریر پڑھنے والے دل پہ ہاتھ رکھ کر کہیں کہ اس سے بڑھ کر حسین و جمیل بلکہ بلیغ بھی کوئی تعبیر "سقوط خلافت راشدہ" کی ممکن ہے جو انہوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں کی کہ زمین اور اہل زمین کے لئے اسلام کا یہ آسمانی نظام دراصل ایک شاندار کثیر المنزلہ عمارت کی شکل میں تھا۔ خلافت نے ملوکیت کی خلعت زیب تن کر لی تو اس کی گویا صرف اوپر والی آخری منزل منہدم ہوئی ورنہ باقی پوری عمارت اپنی پوری شان' پوری فراخی و کشادگی اور پورے حسن استعمال کے ساتھ موجود تھی۔ پھر امتدادِ زمانہ اور زوالِ امت منزل بہ منزل اسے ڈھاتا چلا گیا۔ مسلمان جس رفتار سے اپنے سبق بھولتے گئے' اسی حساب سے رفتہ رفتہ دنیا کی امامت سے محروم

ہوتے چلے گئے تاہم غنیمت ہے کہ وہ سبق حرف غلط کی طرح مٹ نہیں گیا، آج بھی بالکل محفوظ و مامون ہے۔ در بغل داری کتاب زندۂ۔ سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا---- تو حسب سابق ایک بار پھر---- لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا --- اور اللہ کے واضح اعلان کی روشنی میں اسی کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت و کار رسالت کی تکمیل اور ختم نبوت کے منطقی تقاضے کے طور پر اس زمانے کا ایک بار پھر لوٹ کر آنا طے ہے جس کی خوشخبری ہمیں رحمت اللعالمین ؐ نے دی ہے۔ قیامت ہے کہ اس نوید جانفزا کو بھی اہل علم چھپائے بیٹھے تھے بلکہ فی الحقیقت ان کی توجہ اس کی طرف مبذول ہی نہ ہوئی تھی جس کی منادی اب یہ مرد درویش چہار دانگ عالم میں کرتا پھر رہا ہے۔

دوسری "حقیقت" کا ابطال بحث و تمحیص کا بھی محتاج نہیں، صرف مشاہدہ ہی اس کے طلسم کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیتا ہے۔ اے اہل نظر! دور کیوں جاتے ہو، پچھلی دو تین صدیوں کی اپنی ہی تاریخ پڑھ دیکھو۔ خلافت عثمانیہ کی شکل میں جسے تم اب "یورپ کا مرد بیمار" کہتے ہو، خلافت کے "پلازا" کی دو تین منزلیں صحیح سالم تھیں اور کچھ اندازہ بھی ہے کہ کس قدر خیر، کیسی فلاح دینوی اور نظام خلافت کی کتنی برکات کا باعث تھیں؟۔ اللہ اللہ! کیا انتظام و انصرام تھا، کیسا شکوہ ملک و دیں تھا، کیا رعب و دبدبہ تھا، انتظامیہ و عدلیہ کیسی باوقار تھیں، تعلیم و تربیت کا کیا خوب سلیقہ تھا، خدمات عامہ کتنی وافر تھیں، سلطنت کا دفاع کس قدر منضبط تھا، اور تعمیر و ترقی کیسی خوش رنگ تھیں! افسوس، ہم اپنی تاریخ سے بالکل ہی ناواقف ہیں۔ سکولوں کالجوں میں پڑھی بھی تو "مسلم انڈیا" کی تاریخ پڑھی جس کا سب سے "شاندار" دور سلطنت مغلیہ کو قرار دیا جاتا ہے، ان مغل بادشاہوں کا زمانہ جنہیں اپنے محلات کو "رانیوں" سے سجائے رکھنے کے لئے ہر دم ہندوؤں کی خوشنودی مطلوب رہتی تھی۔ انہوں نے مسجدیں کم بنوائیں، محل زیادہ۔ مدرسے نہ ہونے کے برابر اور خاص اپنے لئے باغات جگہ جگہ جبکہ خدمات عامہ کا تو ان کے ہاں کوئی محکمہ تھا ہی نہیں، عدل جہانگیری کی علامت ایک زنجیر کا ذکر ضرور ملتا ہے سو اس تک رسائی کے لئے قصر شاہی تک پہنچنے کی مجال کسے تھی۔ مغلوں کے شاہکار تو تاج محل ہیں جنہیں دیکھ کر آج کا دل جلا شاعر کہنے پر مجبور ہو گیا کہ "اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر، ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق"۔

"خلافت کی جانب رجوع اور اس کی حقیقت" کے عنوان سے امیر تنظیم اسلامی، برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے کالم "تفکر و تدبر" (جنگ لاہور، جمعہ ۱۸ نومبر) کی تحریر پڑھ کر ڈھارس بندھی ہے کہ انہوں نے خلافت راشدہ یعنی خلافت علیٰ منہاج النبوۃ پر اہل علم و دانش کے سامنے اپنے انہی محکم خیالات کو بانداز دگر پیش کرنے کا ارادہ کر لیا ہے جو گزشتہ تین سال سے ان کے خطبات اور عوامی تقریروں کا مرکزی موضوع بنے رہے۔ اب وہ بعض حلقوں کی طرف سے پھیلائی گئی ان الجھنوں کو صاف کریں گے جو نظام خلافت کے قیام کو منہاج النبوۃ سے ہٹائے بغیر دور جدید کے تقاضوں کے ممکن حد تک مطابق بنانے میں درپیش ہیں۔ کیا عمرانیات کے ارتقاء کو جو نسل انسانی کا مشترکہ سرمایہ ہے، بالکل نظر انداز کر کے کوئی بھی قابل عمل اور ہمہ گیر نظام زندگی مرتب کرنا اس زمانے میں ممکن ہے؟۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و سلامتی سے نوازے، یہ کام انہی کے کرنے کا ہے۔ وہی اس کا حق ادا کر سکیں گے۔

البتہ خلافتِ عثمانیہ کے نقشے کے آثار یعنی وہ کھنڈر دیکھ کر جو "خلافت پلازا" کی بچی کھچی دو تین منزلوں کے اسلامبول (یعنی اسلام آباد جو استنبول کا اصل نام تھا) میں نظر سے گزرے اور پھر چند کتابوں میں سوکھے ہوئے پتوں کی طرح ملے تو خود مجھ میں شدید داعیہ پیدا ہوا ہے کہ مسلمانانِ پاکستان کو اس خلافت کا رخ روشن دکھاؤں جس کی صَنم خانہ ہند میں ہم نے جھلک تک نہ دیکھی۔ بلاشبہ تحریکِ خلافت پورے عالم اسلام کو چھوڑ کر صرف یہاں چلی، خلافت کے خاتمے پر سب سے زیادہ سوگ یہاں منایا گیا لیکن اس کے باوجود ہمیں اندازہ نہیں کہ اس سانحہ نے ملتِ اسلامیہ کو اپنے کس مایہ ناز اثاثے سے محروم کر دیا تھا۔ یہ وہ خلافت تھی جس کی بنیاد پھر سے استوار کرنے کے لئے اسلاف کا قلب و جگر درکار ہے۔ ارادہ ہے کہ ترکی کا سفرنامہ مکمل کر کے کتابی شکل میں شائع کرتے ہوئے اس کے دیباچے کے طور پر اس عظیم مملکت کے خد و خال کا تعارف بھی کراؤں جو خلافت عثمانیہ کے نام سے اس تاریخ کا حصہ بنی جس سے ہم تو واقف ہی نہیں، خود ترکوں کو بھی اس سے بیگانہ رکھنے کے لئے اتاترک نے اپنے ماضیٔ قریب سے کاٹنے کی تقریباً کامیاب کوشش کی ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ اس کام کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ سے میرے لئے مہلت صحت و عمر طلب فرمائیں ورنہ گواہ رہیں کہ یہ حسرت ساتھ لے کر جاؤں گا۔OO

بقیہ : اذانِ خلافت

اللہ کی راہ میں جہاد کر رہے ہوں لیکن اپنے دل میں آپ دنیوی مفاد حاصل کرنے کی تمنا رکھتے ہوں۔ مثلاً یہ کہ آپ کا نام سنہرے حروف میں لکھا جائے، یا اس جہاد کے بدلے میں آپ کوئی عہدہ کی خواہش رکھتے ہوں وغیرہ، اگر یہ ہوا تو ہم کبھی بھی اپنی منزل نہ پا سکیں گے۔ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔ یہ تربیت و تزکیے کے وہ مراحل ہیں جو پورے بارہ سال تک مکہ میں طے کئے جا رہے تھے اور اس کے علاوہ اصل بات جو نوٹ کرنے کی ہے جو ہم بڑے واضح طور پر دنیا کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ ان پورے بارہ سالوں کے دوران حکم یہ تھا کہ کسی قسم کی زیادتی یا ظلم کا کوئی جواب دینا تو بہت دور کی بات تھی اپنی حفاظت کے لئے بھی ہاتھ نہ اٹھانا۔ چاہے زبان سے تمہیں ایذا دی جائے چاہے جسمانی طور پر تشدد کا نشانہ بنایا جائے۔ تخریب کاری کی بات تو دور کی ہے یہاں تو اپنی مدافعت میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ حضرت یاسرؓ اور حضرت سمیہؓ دونوں کو ابوجہل نے نہایت اذیت ناک طریقے سے شہید کر دیا تھا۔ کم و بیش چالیس مسلمان اس وقت مکہ میں موجود تھے اور معاذ اللہ ثم معاذ اللہ یہ کبھی خیال میں نہ آنے پائے کہ وہ بزدل لوگ تھے۔ بلکہ اصل بات یہی تھی کہ کسی قسم کی جوابی کارروائی کی اجازت نہیں تھی۔ حکم نہ تھا۔ صبر کریں اور جب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے قریب سے گزرتے تو ان پر ظلم ہوتا دیکھ کر آپ یہی ارشاد فرماتے تھے کہ اے یاسر کے گھر والو صبر کرو۔ تمہارے وعدے کا مقام جنت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہونے والے سیدھے جنت میں داخل ہوں گے۔ سورۂ یٰسین میں ایک سچے صاحب ایمان کا ذکر آیا ہے کہ جب کلمہ حق کہنے کی پاداش میں اسے اس کی قوم نے شہید کر دیا تو اللہ کی طرف سے اسے جنت میں داخلے کی بشارت سنائی گئی "قیل ادخل الجنۃ" داخل ہو جاؤ جنت میں۔

میناروں اور گنبدوں کا شہر استنبول

مولانا رومؒ کا مدفن ہماری رسائی سے باہر تھا

اقتدار احمد

اتاترک نے قوم کو اپنے ماضی قریب سے بھی کاٹ دیا ہے

اتوار ۲ / اگست ۹۲ء کو "آوارہ گردی" کی یہ گشت ختم کر کے ہم اپنے مستقر مرمرہ ہوٹل پہنچے تو یاد آیا کہ استنبول میں ہمارے قیام کے صرف دو دن باقی ہیں جن میں سے پہلا کنونشن کے پروگرام کا ہمارے اعتبار سے اہم ترین دن تھا۔ اس کی شام برادرِ محترم کو بطورِ مہمان مقرر اپنا کلیدی خطاب کرنا تھا' اس سے اگلے دن ہم آزاد تھے کہ جیسے چاہیں بسر کریں اور تیسرے دن بخارے کو واپسی کے سفر کے لئے لاد ہی چلنا تھا۔ چنانچہ کمرے کا رخ کرنے سے پہلے ہم لاؤنج میں قائم اپنی میزبان سیاحتی کمپنی "وی آئی پی" کے کاؤنٹر پر اصالتاً حاضر ہوئے اور یہ ہمارا ان سے اولین براہِ راست رابطہ تھا۔ کاؤنٹر پر موجود دونوں لڑکیاں بیک وقت ہماری طرف متوجہ ہو گئیں کیونکہ انہیں احساس تھا کہ اپنی وضع قطع میں منفرد' کنونشن کے ان دونوں شرکاء کو پہلی بار ان سے کوئی خدمت لینے کی ضرورت پڑی ہے۔

"ہم قونیہ جانا چاہتے ہیں جہاں مولانا رومؒ دفن ہیں۔ اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کیجئے"۔ ہمارا سوال تھا اور جواب دینے سے پہلے انہوں نے اپنے ایک کتابچے کی ورق گردانی کی۔ "ہوائی سفر میں جتنا وقت درکار ہے' وہ آپ شاید ہی نکال سکیں کیونکہ وہاں کے لئے یہاں سے ہفتے بھر میں صرف ایک پرواز جاتی ہے اور وہ بھی تین دن بعد جانے والی ہے۔ سڑک کے ذریعے آپ جب چاہیں' ہم انتظام کئے دیتے ہیں"۔ "فاصلہ یہاں سے کتنا ہے؟" اور جواب نے ہماری امیدوں پر اوس ڈال دی۔ "چھ سو تریسٹھ کلومیٹر۔ بسیں زیادہ وقت لیتی ہیں' ہم آپ کو آرام دہ بڑی کار کرائے پر فراہم کر دیں گے۔ ایک دن جانے اور دوسرا واپسی کے لئے رکھ کر آپ وہاں "اوور نائٹ سٹے" کر لیں تو ایک شام اور اگلی صبح آپ وہاں اطمینان سے گھوم پھر لیں گے"۔ ہمارے پاس اتنا وقت تھا ہی نہیں کہ اگلا سوال کرتے جو ظاہر ہے کہ اخراجات کے بارے میں ہوتا اور جواب ہمارے چھکے چھڑا دیتا۔ ہم ان کا شکریہ ادا کر کے لاؤنج کے ایک صوفے میں ڈھیر ہو گئے۔ اس بات کا ذکر انہوں نے کیا ہی نہیں کہ قونیہ کے لئے ریل گاڑی سے بھی سفر کیا جا سکتا ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ وقت ذرا زیادہ لیتی ہو گی اور پھر شاید اس لئے بھی کہ کار کے انتظام میں جو مفاد یہ سیاحتی کمپنی اٹھا سکتی تھی' وہ ٹرین کے ٹکٹ میں ممکن نہ ہوتا۔ اقبالؒ کے مرشد کے مزار پر حاضری ہماری رسائی سے باہر تھی۔ زبانِ بے زبانی میں عزمے سے مشورہ کیا اور کچھ اپنے ذہن پر بھی زور ڈالا تو اس خیال پر جی ٹھک گیا کہ اپنے طور پر ہی برصہ کے لئے نکل کھڑے ہوں گے۔ برصہ جو ترکی کے ایشیائی حصے اناطولیہ میں استنبول سے صرف دو سو چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ دن بھر میں آمدورفت کا مرحلہ طے ہو سکتا تھا اور ہمیں وہ شہر دیکھنے کا اعزاز حاصل ہو جاتا جو ترکانِ عثمانی کی اناطولیہ میں پہلی مختصر سی سلطنت کا دارالحکومت رہا اور ان کے نسبتاً بعید ماضی کا امین ہے۔

چنانچہ طے پایا کہ اگلا دن کنونشن کی اختتامی تقاریب کے لئے چھوڑ کر منگل کو ہم اس مہم پر نکل کھڑے ہوں گے۔ عزمے کو اپنے فیصلے سے مطلع کیا اور اسے تاکید کی کہ اس سفر کے لئے ضروری معلومات حاصل کر کے پرسوں صبح آٹھ بجے ہمارے پاس چلا آئے جس میں اس کا ساتھ ہمارے لئے غنیمت تھا۔ وہ ہماری صحبت اور خدمت کا ایک اور موقع پانے پر خوش نظر آیا اور گرم جوشی سے مصافحہ کر کے ہم سے رخصت ہو گیا۔ اس شریف نوجوان میں ہمیں اپنے لئے وہی محبت اور عقیدت نظر آئی تھی جو پرانے ترکی کے بڑے بوڑھوں میں پاکستانیوں کے لئے پائی جاتی ہے۔ جس نسل سے اس کا تعلق ہے' اس کا رشتہ اپنے ماضی سے بالکل کاٹ دیا گیا ہے اور دین و شعائرِ دینی سے کسی بھی نوع کی وابستگی کو دل و دماغ سے کھرچ پھینکنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی لیکن ہم سے مل کر اور کچھ وقت ہمارے ساتھ گزار کر اس کے اندر سویا ہوا مسلمان انگڑائیاں لینے لگا تھا۔ میں لفٹ کے ذریعے اپنے کمرے تک کے سفر میں یہی سوچتا رہا کہ مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکوں پر کیا ستم ڈھایا ہے!۔

عصر کی دو فرض جماعت کے بعد سوائے لیٹ رہنے کے اب ہمارے پاس مصروفیت ہی کیا تھی۔ میرے محترم بھائی کی نگاہیں تو مسلمانوں کے ماضی' حال اور مستقبل کو دُور دُور تک دیکھتی ہیں۔ سرمہ ہے ان کی آنکھ کا خاکِ حجاز و ایلیا ۔ خود میں کنویں کا مینڈک ہوں۔ علم کم' بہت ہی کم لیکن جذبات و حسیات بہت' بہت ہی زیادہ۔ جذبے بھی صادق ہوں تو اللہ تعالیٰ کے ہاں شرفِ قبولیت پا ہی لیں گے۔ اور احساس قوی ہو جائے تو آدمی سے کوئی نہ کوئی کام لے ہی لیتا ہے۔ ان کی صداقت پر ہی رحمتِ خداوندی کی اپنی امیدواری کا انحصار ہے' سو وہ بھی کیا معلوم!۔ کیا عجب یہ بھی شیطان کی کھڑی کی ہوئی کوئی دھوکے کی ٹٹی ہو جس کی آڑ میری بے عملی نے عمر بھر لئے رکھی۔ اپنے دل کا یہ چور پکڑنا عرفانِ ذات کے بغیر ممکن نہیں جو حاصل ہو جائے تو آدمی اپنے رب کے عرفان تک جا پہنچتا ہے۔ فھوالمطلوب!۔ "مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ"۔

مغرب کی نماز کے لئے بستر چھوڑنے پڑے تو والدہ صاحبہ کی خیریت دریافت کرنے کے لئے لاہور ٹیلی فون بھی کر لیا۔ الحمدللہ کہ اچھی ہی خبر ملی۔ اس امید نے تقویت پکڑی کہ وہ ہماری واپسی سے پہلے رختِ سفر نہیں باندھ لیں گی۔ پھر ڈاکٹر خورشید ملک' ڈاکٹر طارق چیمہ اور فہیم الدین چودھری تشریف لے آئے۔ ہم "ندائے خلافت" کے جو سیٹ اور تنظیم اسلامی کا بزبانِ انگریزی جو اساسی لٹریچر ساتھ لائے تھے اسے دو تین دن کنونشن ہال کی غلام گردش میں ایک سٹال لگا کر برائے فروخت پیش کیا گیا تھا اور یہ سارا انتظام و انصرام لاہور کے نوجوان ڈاکٹر طارق چیمہ کے سپرد تھا لیکن نکاسی بہت کم ہوئی۔ دراصل اس سٹال کے آس پاس لٹریچر کی قسم کی چیزیں کئی سٹال مفت تقسیم کر رہے تھے چنانچہ "خریداری" کا رجحان نہ ہونے کے برابر رہا۔ فیصلہ کیا گیا کہ "ندائے خلافت" تو مفت ہی پیش کر دیا جائے البتہ کتابیں جو بچ گئی ہیں' انہیں ہمارے یہ دوست واپسی پر امریکہ ساتھ لے جائیں اور شکاگو میں ہماری مقامی تنظیم کے حوالے کر دیں۔ ڈاکٹر خورشید ملک مع اہل و عیال تشریف لائے تھے اور واپسی کے سفر میں عمرہ کرنا ان کے پروگرام کا حصہ تھا' ڈاکٹر طارق چیمہ تھے ہی "مقامی" آدمی یعنی استنبول میں ہی زیر تعلیم ہیں۔ فہیم چودھری براہِ راست شکاگو واپس جانے والے تھے لہٰذا یہ ذمہ داری انہوں نے ہی قبول کی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔

میں نے اپنے کتابچوں کے ذخیرے کا جائزہ لیا جو سیاحوں کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ قیمتاً خریدے تھے اور کچھ مفت میں ادھر اُدھر سے ہاتھ لگے۔ موجودہ ترکی اور استنبول کے بارے میں معلومات کے دریاؤں کو کوزوں میں بند کر دیا گیا تھا لیکن مجال ہے جو کہیں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہو کہ "کھنڈر گواہ ہیں کہ عمارت عظیم تھی"۔ یہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا' شاید مغرب کی طرف سے یلغار کرنے والے سیاحوں کو ناگوار گزرتی ہو گی جو یہاں آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں' جیبیں بھر کے ڈالر لاتے اور خوب لُٹاتے ہیں۔ ے خانوں' جوا خانوں' ڈسکو اور نائٹ کلبوں کی تفصیلات البتہ اکثر کتابچوں میں پورے اہتمام سے دی گئی تھیں جو اس دنیا کا حصہ ہیں جس سے ہمارا اُدھر پار کا بھی کوئی علاقہ نہیں۔ خود مرمرہ ہوٹل کے ے خانے کو بھی نمایاں حیثیت حاصل تھی جس کی جھلک لاؤنج کو عبور کرتے ہوئے کئی بار دیکھی تاہم اس کا نائٹ کلب انتظامیہ کو چند دنوں کے لئے بند کرنا پڑا تھا۔ اس کے ایک حصے کو ہمارے کنونشن ہال میں اور دوسرے نسبتاً چھوٹے ہال کو جو "بال روم" یعنی ناچ گھر تھا' آئی ایم اے نے عارضی مسجد میں تبدیل کر رکھا تھا۔ یہاں چند روز نمازوں کی رونق رہی اور سورۃ الحجرات کی روشنی میں ایمان و اسلام کے فرق پر ہر صبح فجر کے بعد ایک لیکچر ہوا لیکن یہ بہارِ چند روزہ بس ایک دن کی اور مہمان ہے۔ پھر سفلی جذبات کی سلگتی آگ کو بھڑکا کر شعلہ بداماں کر دینے والی وہی موسیقی ہو گی اور اس کی لہروں پر تھرکتے ہوئے بہکتے وہی جسم جو زبانِ حال سے پکار رہے ہوتے ہیں کہ "آج کی رات کبھی ختم نہ ہونے پائے"۔ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست!۔

کھانے کے لئے پہلوان ہوٹل کا چکر لگانے کے بعد ہم نے عشاء کی نماز ادا کی اور پھر سونے کے لئے دراز ہو گئے۔ ذرا کی ذرا ریموٹ کنٹرول کے ذریعے ٹیلی ویژن "آن" کیا تو بی بی سی ورلڈ سروس سے سندھ میں ڈاکوؤں کی سرگرمیوں پر ایک رپورٹ ٹیلی کاسٹ ہو رہی تھی۔ ہم دونوں بھائی سیدھے ہو بیٹھے۔ اپنے ملک کے یہ مناظر نہ کبھی ہماری نظروں سے گزرے تھے نہ اندازہ ہی تھا کہ ڈاکوؤں کے ٹھکانوں کا ماحول کیا ہوتا ہے۔ ان میں "سمع و طاعت فی المنکر" کا کیسا مضبوط نظم کام کر رہا ہے اور اپنے اس مذموم کام کا وہ خود کیا جواز رکھتے ہیں۔ وارداتیں کیسے کی جاتی ہیں اور مالِ غنیمت کی تقسیم کا اصول کیا ہے۔ ان گروہوں کے پاس مواصلات کے ذرائع کتنے جدید ہیں اور اسلحہ کیسا خودکار و دہشتناک!۔ مقامی انتظامیہ سے ان کی آنکھ مچولی اور پولیس کے ساتھ ملی بھگت بھی ایک کھلے راز کی طرح سامنے پڑی تھی۔ کسی پاکستانی کی مجال تھی جو ایسی کوئی فلم بنا سکتا؟۔ بی بی سی اور رائٹر نے نجانے اس نصف گھنٹے سے زیادہ طویل فلم کے لئے کیا کیا پاپڑ نہ بیلے ہوں گے' کیا کیا ضمانتیں دے کر ڈاکوؤں کا تعاون حاصل کیا ہو گا' کتنی بڑی رقم خرچ کی ہو گی اور کیمرہ مین جانیں ہتھیلی پر رکھے بغیر تو یہ مناظر فلمانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہوں گے!!

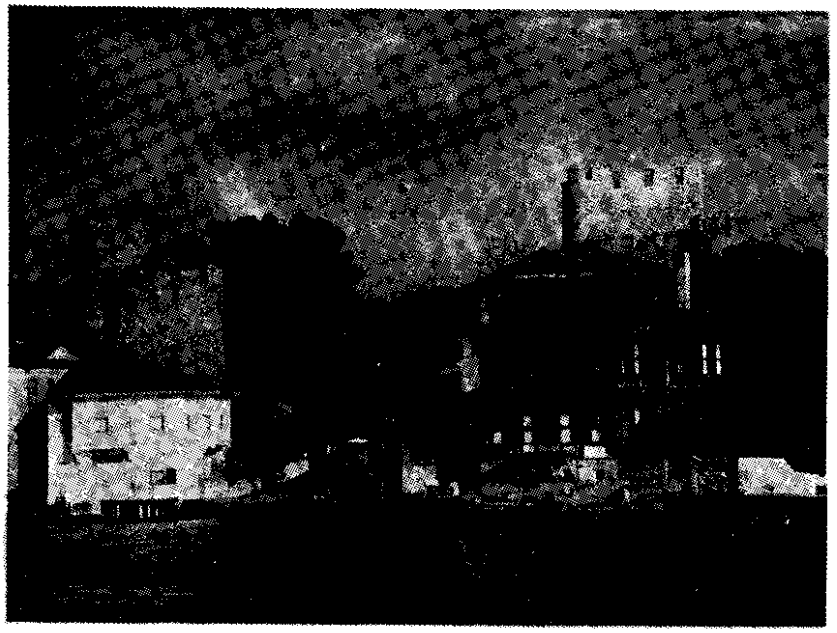

"اناد ولو حصاری" نام کا یہ قلعہ آبنائے باسفورس کے ایشیائی کنارے پر واقع ہے

-- خود ہمیں ہمارے اصل حالات سے باخبر رکھنے کے لئے یہ غیر ملکی لوگ ایسی ایسی جان لیوا مہمات کیوں سر کرتے ہیں؟ اور بلاشبہ یہ "انفرمیشن" تھی "ڈس انفرمیشن" نہیں بلکہ ہمارے ذرائع ابلاغ کے لئے مقام عبرت بھی۔ غالباً ان کا مقصد اپنا اعتبار قائم کرنا ہے جو بوقتِ ضرورت بہت کارگر ثابت ہوتا ہے۔

یہ چشم کشا فلم دیکھ کر ہماری نیندوں کو اڑ جانا چاہئے تھا اور یہ کیفیت کچھ دیر برقرار بھی رہی لیکن آخرکار اس تکان کا داؤں لگ گیا جو آج ہم نے پیدل گھوم پھر کر اپنے جسموں پر طاری کر لی تھی۔ شب بھر کی پُرسکون نیند لینے کے بعد برادر محترم نے مجھے فجر کی نماز کے لئے حسب معمول جگایا تو طبیعت ہشاش بشاش

تھی۔ نماز اور اس سے فراغت کے بعد ان کا لیکچر اور پھر ناشتہ۔ ناشتے کے بعد بھرے پیٹ کے ساتھ غنودگی کا ایک اور دَور چلا کیونکہ دوپہر تک کوئی اور مصروفیت نہ تھی لیکن اس فرصت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھا پائے تھے کہ ایک صاحب ملاقات کے لئے تشریف لے آئے۔ برادر محترم سے یک طرفہ تعارف رکھتے تھے۔ بہت پہلے مسجد خضراء سمن آباد لاہور میں ان کے چند دروسِ قرآن اور خطباتِ جمعہ سنے تھے جو فراموش نہ کر سکے اور ڈاکٹر طارق چیمہ کے مقامی حلقۂ احباب کے ذریعے انہیں خبر ملی تھی کہ ڈاکٹر اسرار احمد استنبول میں ہیں۔ جوئندہ یابندہ' ڈھونڈتے ڈھانڈتے ہمارے کمرے تک آ پہنچے۔ چند جملے انگریزی میں بولتے اور پھر اردو پر آجاتے لیکن ان کی اردو پر ترکی زبان کا گہرا اثر تھا۔ پاکستان سے نکل کر وہ یورپ پہنچے اور وہاں قیام کے دوران ایک ترک لڑکی سے شادی کر لی جو پھر انہیں یہاں اپنے وطن میں لے آئی۔ اب پندرہ بیس برسوں سے استنبول میں ہیں۔ مقامی اخبارات میں لکھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ترکی زبان میں ہی لکھتے ہیں۔ ترکی معاشرے کی کیفیت بتائی اور پاکستان کے بارے میں سوالات کرتے رہے۔ خاصے ہی باخبر آدمی تھے تاہم پاکستان کے بارے میں متعدد غلط فہمیوں کا شکار تھے' بالخصوص اسلامی تحریکوں سے کچھ زیادہ ہی توقعات وابستہ کئے بیٹھے تھے۔ ان کی یہ خوش فہمی دور کر کے ہمیں خوشی تو نہ ہوئی لیکن حقائق تو آخر حقائق ہیں' ان پر پردہ کب تک ڈال کر رکھا جا سکتا ہے۔ انہیں ہم نے "ندائے خلافت" کے پرچوں کا ایک سیٹ اور اپنی کتابیں مطالعہ کے لئے دیں۔

ان صاحب کا ترکی کی اسلامی سیاسی جماعت کے (اسلام جس کے نام کا حصہ بہرحال نہیں کیونکہ یہ "حرکت" وہاں غیر آئینی ہے) رہنما جناب نجم الدین اربکان سے بھی رابطہ تھا۔ کہنے لگے کہ وہ ان دنوں یہاں موجود نہیں ورنہ آپ لوگوں کی ان سے ملاقات ضرور کرواتا۔ ہم نے ان کو پہنچانے کے لئے بھی اپنے کتابچوں کا ایک سیٹ انہیں دیا۔ ان کا وعدہ تھا کہ نہ صرف یہ لٹریچر جناب اربکان تک پہنچائیں گے بلکہ ان کے تاثرات بھی حاصل کر کے خط کے ذریعے ہمیں منتقل کریں گے۔ جس گرمجوشی کا اظہار وہ کرتے رہے اس سے ہم یہ توقع رکھنے میں حق بجانب تھے کہ اس کام میں ان سے کوتاہی نہ ہوگی لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ ان سے وہی رابطہ آخری ثابت ہوا۔ بعد میں.... "نہ آپ آئے نہ بھیجیں بتیاں"۔

ان صاحب سے ہماری گفتگو آخری مرحلے میں تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ لاؤنج میں ہمارا انتظار ہو رہا تھا۔ وی آئی پی کمپنی کی لگژری بسیں آئی ایم اے کنونشن کے شرکاء کو ڈھو رہی تھیں اور تاخیر کا مطلب یہ ہوتا کہ ہم کنونشن کی اس آخری اجتماعی تفریح سے محرومی کا داغ لے کر پاکستان واپس آتے۔ اپنے مہمان سے معذرت کرتے ہوئے ہم جھٹ پٹ تیار ہوئے' میں نے اپنا کیمرہ بھی سنبھالا اور غنیمت ہے کہ لفٹ نے بھی زیادہ انتظار نہ کرایا۔ آخری بس کو ہم نے بھی جا ہی پکڑا۔ یہ پروگرام ایک تفریحی "یاٹ" (YACHT) میں آبنائے باسفورس کی سیر کا تھا جس کے دوران ظہرانہ بھی پیش کیا جانا تھا۔ بسوں نے ہمیں ساحلی سڑک پر لے جا کر ایک ٹرمینل پر جا اتارا جہاں چھوٹے بڑے جہاز لنگر انداز تھے۔ ہر سائز کی مشینی کشتیاں بھی ادھر ادھر پھسلتی پھر رہی تھیں اور باربرداری کا کام بھی جاری تھا۔ ہم پانی کے ہلکوروں پر لرزتی کشتیوں کو کھڑکھڑاتے تختوں کے ذریعے عبور کرتے اپنی یاٹ تک پہنچے۔ کشتی سے بہت بڑی اور مسافر بردار جہاز سے خاصی چھوٹی یہ یاٹ تین منزلہ تھی۔ سب سے زیریں سطح پر انجن روم' عملے کی رہائش اور باورچی خانے وغیرہ ہوں گے۔ درمیانی منزل کسی بڑے ہوٹل کے ریستوران کی طرح تھی' اگرچہ میزوں کے درمیان وہ فاصلے نہیں تھے جو اچھے ریستورانوں میں نقل و حرکت کی سہولت کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ ان میزوں کے دونوں طرف بیٹھنے والوں کے لئے بھی بڑے بڑے شیشوں والی کھڑکیوں کے ذریعے باہر کا منظر بالکل کھلا تھا تاہم زیادہ شوقین لوگوں کے لئے اوپر والی منزل کی جانب ایک فراخ زینہ چڑھ رہا تھا۔ اوپر چلے جائیے تو وہاں کھانے کی میزوں کے علاوہ آرام دہ بنچ بھی ہیں جن پر خوب پھیل کر بیٹھئے' دُور دُور تک کا نظارا کیجئے اور کیمرہ ساتھ ہو تو تصویریں بھی کھینچئے۔

مرکزی ساؤنڈ سسٹم کے ذریعے آبنائے باسفورس کی اس سیر کا تعارف کرایا گیا۔ گائیڈ بتا رہا تھا کہ آپ لگ بھگ تین گھنٹے اس خوبصورت بجرے میں ہمارے مہمان رہیں گے جس کے دوران دوپہر کے کھانے سے آپ کی تواضع بھی ہوگی۔ ڈیڑھ گھنٹے کا سفر باسفورس کے اس سرے کی جانب ہوگا جو "اناطولین سی" میں جا کر کھلتا ہے۔ بحر اناطولین بحیرہ روم کے اس حصے کا نام ہے جو ترکی اور یونان کے کٹے پھٹے ساحل کے ساتھ چلتا ہوا سابق یوگوسلاویہ سے گزرنے کے بعد اس شناخت سے محروم ہو کر بحیرۂ روم یعنی میڈیٹرینین بن جاتا ہے۔ اگلے ڈیڑھ گھنٹوں میں ہم واپسی کا سفر طے کریں گے۔ "آپ کا یہ خادم کنارے کے دونوں جانب نظر آنے والے اہم اور تاریخی مقامات کا آپ سے تعارف بھی کراتا جائے گا۔ تاہم محترم خواتین و حضرات! آپ کے ذہن میں کوئی سوال اٹھے جس کا جواب میری گفتگو میں نہ آیا ہو تو ہاتھ بلند کر کے بلا تکلف پوچھئے' میں آپ کو نظر آتا ہوں یا نہیں لیکن آپ سب میری نگاہوں کے حصار میں ہیں۔ اب آپ اطمینان سے تشریف رکھئے' ہم اپنا سفر شروع کر رہے ہیں"۔

یاٹ کے انجنوں سے کچھ ایسی نرم و نازک سی آوازیں بلند ہوئیں جیسے دو چار کاروں کے انجن بیک وقت سٹارٹ کئے گئے ہوں۔ عملے کے کچھ لوگوں نے ساتھ کھڑے دوسرے جہازوں کی ٹیک لے کر اور بانسوں کی طرح کے لمبے ڈنڈوں سے دھکیل کر ہمارے بجرے کا رخ درست کیا اور بسم اللہ مجریھا ومرسٰھا۔ آبنائے باسفورس خود تو بڑی پرسکون ندی ہے لیکن جہازوں کا ٹریفک جو لہریں پیدا کرتا ہے اس کے تھپیڑے ہماری یاٹ کا منہ لال کئے دے رہے تھے۔ تاہم ان سے اس کے خرامِ ناز نے کوئی اثر قبول نہ کیا۔ یوں تو ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے لیکن اس نوع کی "عیاشی" کا موقع زندگی میں پہلی بار ملا اور یہ اندازہ بھی ہوا کہ "شاہی بجرے" کیسے ہوتے ہوں گے اور آنجہانی جیکولین اوناسس اور خشوگی جیسے ارب پتی لوگ یا پھر اپنے عوام کا خون چوسنے والے حکمران خصوصی و ذاتی بجرے کیوں رکھتے ہیں۔ ان میں گزارے ہوئے شب و روز کا نقشہ کیا ہوتا ہوگا۔ وقفے وقفے سے گائیڈ کی آواز بلند ہوتی۔ "خواتین و حضرات ادھر دیکھئے' یہ فلاں تاریخی عمارت ہے" اور "بس اب ہم اس طویل معلق پل کے نیچے سے گزرنے والے ہیں جو ایشیا کو یورپ سے ملاتا ہے۔ ذرا اس کی بلندی کا تو اندازہ کیجئے"۔ دریں اثناء وردی پوش لڑکوں لڑکیوں نے ہمارے سامنے کھانے کا پہلا کورس رکھنا شروع کر دیا۔ یہ گرم گرم سوپ کے پیالے تھے جن کے ساتھ مجنوں کی پسلیوں اور لیلیٰ کی انگلیوں کی طرح کے دبلے پتلے اور لمبے لیکن بہت لذیذ نمکین بسکٹ بھی آئے۔ سوپ کے ساتھ انہوں نے بڑا مزا دیا' بالکل ویسا ہی جیسا لطف ۱۹۶۸ء کے حج کے دوران منیٰ میں چائے پلاتے ہوئے ایک ترک بوڑھے نے یہی چیز باصرار مجھے کھلا کر دیا تھا۔ اس وقت البتہ

ان کے ذائقے میں نمکینی کے ساتھ بڑے میاں کی محبت و شفقت کی چاشنی کی آمیزش نے مٹھاس بھی پیدا کر دی تھی۔ پھر کچھ دیر گائیڈ کی آوازوں کی طرف توجہ کم اور کھانے کی طرف زیادہ رہی۔ یہ بھی ترکی کے وہی روایتی کھانے تھے' اشتہا انگیز' لذیذ' دیکھنے میں خوبصورت' چبانے اور نگلنے میں آسان اور معدے پر گرانی کے اثرات چھوڑے بغیر ہضم ہو جانے والے۔ پینے کے لئے پانی' کوکا کولا اور "ایرن" یعنی وہی کی پتلی لسی جو وہاں کھانے کی قسمیں بٹھانے کے کام آتی ہے اور میٹھے میں روغن زیتوں میں تلی ہوئی شہد سے تربتر وہی کئی چیزیں جن کی یاد سے ہی اب منہ میں پانی بھر آتا ہے۔

کھانے کے خاصے طویل سلسلے کے دوران ہی ہماری میز کے دوسرے ساتھی برادر محترم سے سنجیدہ موضوعات پر گفتگو کا آغاز کر چکے تھے اور صاف نظر آ رہا تھا کہ بات سے بات نکلتی چلی جائے گی چنانچہ میں نے وہاں سے کھسک جانے میں عافیت جانی۔ زینہ طے کر کے اوپر چلا آیا' دو چار تصویریں بنائیں اور پھر کھلے آسمان کے نیچے عرشہ پر بچھے ایک بنچ پر آ بیٹھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر لوگ اب اسی طرف ٹولیوں میں جمع ہو رہے تھے۔ میں بھی ایک چوکڑی کے گھیرے میں آگیا جس میں یوپی سے تعلق رکھنے والے ایک خوش ذوق امریکی ڈاکٹر صاحب میرے جانے پہچانے بھی تھے۔ پچپن ساٹھ کے پیٹے میں گدرے جسم والے یہ بزرگ بذلہ سنجی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ سال بھر پہلے شکاگو میں ایک پکنک کے موقع پر ان کے لطیفوں سے محظوظ ہوا تھا' یہاں انہوں نے ماحول کا اثر قبول کرتے ہوئے حسبِ حال خوبصورت اشعار سنانے شروع کئے اور محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ ایسے بے فکرے لوگ بھی انسانی معاشرے کی ضرورت تو ہیں لیکن بس ایک حد تک ورنہ ہنسنے کھیلنے میں ہی زندگی گزار دی جائے اور اس تفکر و تدبر کے لئے فرصت ہی میسر ہی نہ ہو جس کی دعوت اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مبین میں اولالالباب کو بار بار دی ہے تو اس چند روزہ حیاتِ مستعار کے بعد آنے والی اصل اور ختم نہ ہونے والی زندگی روتے بلکتے اور آہ و فغاں کرتے گزرے گی۔ اللہ تعالیٰ اس انجام بد سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔ اس خیال کے علاوہ مجھ پر افسردگی کا دورہ پڑنے کا سبب ہمارے گائیڈ کا ایک تازہ اعلان بھی بنا۔

"خواتین و حضرات! دائیں طرف ایشیا کے ساحل پر آپ کو ایک قلعے کی کچھ باقیات نظر آ رہی ہیں۔ یہ "انادولو حصاری" کا ایک حصہ ہے جسے از سر نو بحال کیا گیا ہے۔ عثمانی ترکوں نے اناطولیہ میں اپنی چھوٹی سی سلطنت قائم کر لینے کے بعد جب یورپ کی طرف دیکھنا شروع کیا تو سب سے پہلے یہ قلعہ تعمیر کیا تھا تاکہ باسفورس کی تنگ آبنائے پر نظر رکھ سکیں جسے عبور کر کے ایک دن انہیں قسطنطنیہ پر دھاوا بولنا تھا۔ اس قلعے کی تعمیر چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں سلطان بایزید اول نے کی تھی۔ لیکن ابھی وہ اس آبی راستے کی چوکیداری ہی کر رہے تھے کہ ترکوں کو اپنا پیچھا سنبھالنے کے لئے واپسی کا سفر کرنا پڑ گیا کیونکہ اناطولیہ میں ان کے مقبوضات کو تیمور لنگ نے آ کر تاراج کرنا شروع کر دیا تھا۔ یوں سمجھئے کہ ان کی دم میں "آگ لگا دی"۔ ترک گائیڈ کا یہ اندازِ گفتگو مجھ پر ستم ڈھا رہا تھا' مجھے اداس کر گیا۔

اس کم بخت گائیڈ نے اتنا بھی نہ سوچا کہ اپنے عظیم المرتبت بزرگوں کا خاکہ اڑا کر وہ اپنی قوم سے ہی نہیں پوری ملتِ اسلامیہ سے تمسخر کر رہا تھا۔ دراصل یہ لوگ مغرب سے آنے والے سیاحوں کو مخاطب کرنے کے عادی ہیں جو عیسائی ہوں نہ ہوں' اسلام دشمن صلیبی ضرور ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے یورپ میں داخلے کا گھاؤ ان کے سینوں میں آج بھی تازہ ہے جس سے ترکی کے یورپی حصے میں آ کر خون رِسنے لگتا ہے۔ اس پر مرہم رکھنے کا کام سیاحت کے یہ پیشہ ور گائیڈ اس بھونڈے انداز میں کرتے ہیں۔ یہ باتیں ان کی زبان پر چڑھ گئی ہیں جنہیں دُہراتے ہوئے ہمارا گائیڈ یہ بھی فراموش کر بیٹھا کہ اس کے مہمان چھ سات سو مردوزن سب کے سب اپنے ماضی پر فخر کرنے والے مسلمان ہیں۔ اتاترک کے جدید ترکی کا مضبوط ترین آئینی تحفظ رکھنے والا ٹن ٹن بولتا سیکولرزم اور اسلام سے عملی اعلانِ بیزاری بھی آج تک اسے یورپی برادری میں قبولیت کے شرف سے نہیں نواز سکا جس کے لئے سرتوڑ کوششیں تاحال جاری ہیں تاہم اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو بوسنیا ہرزیگوینا سے از سرنو آغاز کرنے والے صلیبی جنگ کے نئے سلسلے نے ترکی کی ان مساعی کو ناقابل تلافی ضعف پہنچایا ہے۔ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ WASP یعنی سفید فام اینگلو سیکسن پروٹسٹنٹ اقوام اپنی صفوں میں مسلمانوں کا ایک "فتنۂ کالم" کیونکر قبول کر لیں گی۔ اس خوابیدہ فتنے کو بلی سمجھ کر گود لینے پر کبھی آمادہ نہ ہوں گی جس کے بارے میں ملت کے حدی خواں' اقبالؒ نے قدسیوں سے سُن رکھا ہے کہ "وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا"۔ (باقی باقی)

بقیہ : اداریہ

منہ پر بھرپور طمانچہ اور اس کلچر کی منہ بولتی تصویر ہیں جو امریکہ کو اور پورے فرنگ کو مرغوب ہے۔ لیکن "وہی میری کم نصیبی' وہی تیری بے نیازی۔ میرے کام کچھ نہ آیا' یہ کمال نے نوازی۔" پاکستان پر چچا سام مہربان ہو کر نہیں دیتے' ہمارے حصے میں تو بس دُور کا جلوہ ہے جس کی جھلک کے لئے وہ باری باری اپنی دو خاتون نائب وزراء کو ہی تبدیلیٔ آب و ہوا' سیر سپاٹے اور مُن مُن لینے کے لئے بھیج دیتا ہے۔ قصۂ زمین برسر زمین تو یہ ہے کہ حطار میں الیکٹریکل کمپلیکس کی افتتاحی تقریب میں فی البدیہہ تقریر کرتے ہوئے بے نظیر صاحبہ امریکہ اور اس کے تابع مہمل یو این او پر برس پڑیں' زیر زمین خاموش سفارت کاری میں پخت و پز کس مرحلے میں ہے؟ فریقین جانیں یا پھر اُوپر والا جانے۔

عالم اسلام اور دنیا کی واحد سپریم پاور سے ہمارے معاملات و تعلقات کی نوعیت و کیفیت سے ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہماری خارجہ پالیسی نے دوسرے متعلق و غیر متعلق حلقوں میں کامیابی کے کتنے کچھ جھنڈے گاڑے ہوں گے۔ قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا۔ دوسری طرف ہمارا واسطہ بھارت سے ہے جس کی سفارت کاری کا جادو دنیا کے سرچڑھ کر بولتا سنائی دیتا ہے۔ ایسے میں اپنی خارجہ پالیسی کے بارے میں کہیں تو کیا اور اس کو مرتب کر کے روبہ عمل لانے والوں کی "قابلیت و اہلیت" کا اعتراف کریں تو کس شایانِ شان انداز میں۔ "ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات"۔ یہ سزا ہم بھگتنے پر مجبور ہیں اور اس وقت سے مجبور چلے آ رہے ہیں جب سے ہماری اس امریکی "لاٹری" کی ادائیگی کی اقساط ختم ہوئی ہیں جو جہادِ افغانستان کی شکل میں نکل آئی تھی۔ خارجہ پالیسی تو خود مختار و باوقار قوموں کی ہوتی ہے اور ایسی کوئی قوم بننے کے عزائم تاحال ہم نے سینوں میں بیدار ہی نہیں کئے۔ پھر دوسروں سے تو اللہ میاں کہہ سکتے ہیں کہ "تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن' اپنا تو بن" --- ہم اگر اللہ کے نہ بنے تو اپنے بھی ہرگز نہ بن سکیں گے کیونکہ ہم اپنے رب سے کئے ہوئے عہد و پیمان کو حد درجہ ڈھٹائی سے توڑنے کے جرم کا ارتکاب کر چکے ہیں اور بدقسمتی سے اپنے اس رویّہ پر قائم رہنے پر پورے زور سے اصرار بھی کر رہے ہیں۔ OO

بقیہ : حدیثِ امروز

عالم میں کوئی اہلکار اگر رنگے ہاتھوں پکڑا جائے تو کیا محض اس خوف سے اسے بخش دیا جائے گا کہ ملک بھر کے رشوت خور بطور احتجاج ہڑتال کر کے کاروبار مملکت کا پہیہ جام کرسکتے ہیں؟۔ پاکستان کا کاروباری طبقہ میاں صاحب کی گرفتاری پر جس ردعمل کا اظہار کر رہا ہے اسے سند جواز دے دی جائے تو انگریز کے چھوڑے ہوئے اس پورے قانون کی بساط ہی کو لپیٹنا نہ پڑے گا جسے اس کے پاکستانی وارثوں نے متعفن بدعنوانیوں کا سنڈاس بنا دیا ہے بلکہ اپنے سارے اخلاقی و دینی ضابطوں کو بھی ایک ہی بار رو دھو کر فارغ ہو جانا لازم نہ ہو جائے گا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ میاں صاحب کی سماجی حیثیت اپنی جگہ لیکن آخر تو وہ انہی بارہ کروڑ افراد میں شامل ہیں جنہوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنایا اور جن کا مرنا جینا اسی سے وابستہ ہے تو انہی کے ساتھ زیادتی پر شور قیامت کیوں اٹھا جبکہ یہاں شب و روز سینکڑوں نہیں ہزاروں بچوں' جوانوں اور بوڑھوں پر مشقِ ستم کی جاتی ہے؟۔ تھانوں اور چوکیوں میں ماؤں' بہنوں' بیٹیوں پر جو قیامت ٹوٹتی ہے' اخبارات میں کسی قدر تفصیل سے رپورٹ ہو جانے والے محض چند واقعات سے ان کا صرف اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ معصوم بچوں اور ہڈیوں کے ڈھانچے بنے ہوئے دائم المرض بوڑھوں کے ساتھ قوانین و ضوابط کی راہداریوں میں جو سلوک ہوتا ہے' اس کا تجربہ کتنے لوگوں کو ہے اور اندازہ کسے نہیں۔ آج تک پوری طرح منظرِ عام پر آجانے والے اس قسم کے کسی ظلم کے خلاف اس ردعمل کا اظہار ہوا جو میاں صاحب کی گرفتاری پر ہوا ہے جس کا بذریعہ ہوائی جہاز اسلام آباد منتقل' ایک باآسائش ریسٹ ہاؤس میں نظربندی اور طبیعت خراب ہو جانے پر فوراً بہترین طبی امداد کی فراہمی مصدقہ حصہ ہیں؟۔ کیا سب انسان اشرف المخلوقات کی ایک ہی نسل سے تعلق نہیں رکھتے' کیا یہ سب ایک ہی طرح کے گوشت پوست سے بنے ہوئے نہیں ہیں؟

میاں محمد شریف ہمارے قابلِ احترام بزرگ ہیں۔ انہیں جس صدمے سے دوچار ہونا پڑا' اس پر ہمیں بھی رنج و ملال ہوا اور کسی شمار قطار میں آئے تو ہمارے اظہار ہمدردی کو بھی وہ اپنے خیر خواہوں کے جذبات و احساسات میں شامل کر لیں۔ پھر موجودہ حکومت کی نالائقی و نابنجاری نے ہمیں بھی بے طرح مایوس کیا ہے' یہ الگ بات ہے کہ ماضی میں بھی ایسی مایوسیاں ہمارا مقدر رہیں اور مستقبل قریب میں ان سے رستگاری کی کوئی امید نہیں تاہم ان دو ہی سوالات نے ہمیں لاجواب کر دیا ہے جبکہ ضمنی سوالات درجنوں کی تعداد میں اذنِ کلام کے لئے دست بستہ کھڑے ہیں لیکن بس آگے حدِ ادب!۔OO

بقیہ : پریس ریلیز

چنانچہ ان دونوں ممالک کو گھیرنے اور چین پر چوکی پہرے کے سلسلے میں اس علاقے پر توجہات مرکوز کر دی گئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے اندر اور اس کے چاروں طرف آج ہمیں سازشوں کے نئے سے نئے جال پھیلتے نظر آ رہے ہیں۔ اندرون ملک سیاسی محاذ آرائی اور فرقہ واریت خطرناک حدود کو عبور کر چکی ہے۔ اسلحہ کی ریل پیل ہے اور ایسے مظاہر سامنے آ رہے ہیں کہ کراچی اور سندھ میں بیرون سرمایہ آ رہا ہے جبکہ مقامی سرمایہ وہاں سے راہ فرار اختیار کر رہا ہے۔ امن عامہ کی صورت حال مخدوش سے مخدوش تر ہوتی جا رہی ہے لیکن زمینی جائداد کی قیمت بڑھ رہی ہے اور بحیثیت مجموعی کہا جاسکتا ہے کہ ملکی حالات کس وقت کیا کروٹ لے لیں۔OO

بقیہ : امریکی عزائم

پیداوار میں کمی کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دالیں اور سبزیاں انتہائی مہنگی ہو چکی ہیں۔ عام بیماریوں میں استعمال کی جانے والی ادویات میں نہ صرف سستے درجے کا میٹریل استعمال کیا جا رہا ہے بلکہ ان کی قیمتوں میں بھی ہوشربا اضافہ ہوگیا ہے۔ جان بچانے والی ادویات تو مزدور پیشہ طبقے کی استطاعت سے بالکل ہی باہر ہوگئی ہیں۔ درآمدات کی نرم پالیسی کے باعث مقامی صنعتیں کسمپرسی کا شکار ہیں۔ سفید پوش یا درمیانہ طبقہ ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ عام آدمی کو زندگی میں معاشی پریشانیوں کے اضافے کے باعث پورا معاشرہ فرسٹریشن اور اعصابی دباؤ کا شکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جرائم کی سطح پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ بلند ہوگئی ہے۔ کرپشن نے اپنے پنجے معاشرے کے جسم میں اس طرح پیوست کر دیئے ہیں کہ ملک کا ہر طبقہ حتیٰ کہ بعض دینی اداروں اور دینی جماعتوں سے وابستہ افراد بھی اس حمام میں عریاں نظر آتے ہیں۔

گزشتہ مالی سال ۹۴ - ۱۹۹۳ء میں پاکستان پر غیر ملکی قرضوں کا بوجھ ۲۰ ارب ڈالر تھا۔ ان قرضوں کی ادائیگی کے لئے پاکستان کو ہر سال ایک ارب ۳۷ کروڑ ڈالرز کی ادائیگی کے لئے پاکستان کو ہر سال ایک ارب ۳۷ کروڑ ڈالرز کی ادائیگی کرنا پڑتی ہے۔ اس ادا شدہ رقم میں اصل زر کو چھوڑ کر صرف سود کی مد میں ادا کی جانے والی رقم ۶۶ کروڑ روپے سالانہ ہے۔ گویا ہم نے جتنا قرض لیا ہے اس کے مقابل کہیں زیادہ سود کی رقم واجب الادا ہے اور اس رقم کا انتظام پاکستان کے عوام کی خون آشامی کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

وزارت خزانہ اور منصوبہ بندی کمیشن (Planning Commission) میں بیٹھے ہوئے ان مالیاتی اداروں کے مشاورین ہمہ وقت پاکستانی اقتصادیات پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کی اولین کوشش یہ ہوتی ہے کہ قرضوں کی واپسی کے لئے رقم کا انتظام ہر صورت میں ممکن بنایا جائے' خواہ اس کے لئے آدمی کی زندگی کتنی ہی کربناک کیوں نہ ہو جائے۔ ان مشاورین کی طاقت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ریلوے کے کرائے تک ان ہی کے منظور کردہ ہوتے ہیں۔ اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ کی آڑ میں بجلی' گیس' کوئلے' مٹی کے تیل اور دیگر ذرائع ایندھن کی قیمتیں اتنی بلند کر دی گئی ہیں کہ ان کا استعمال آئندہ چند برسوں میں عام آدمی کے لئے صرف خواب ہی بن کر رہ جائے گی۔

اس صورت حال سے اندازہ ہوتا ہے کہ چند مخصوص یورپی اقوام کے سوابقیہ تمام اقوام عالم امریکی عزائم کی بھینٹ چڑھی ہوئی ہیں۔ امریکہ دوہرا معیار اور غیر منصفانہ رویہ اگر ایک جانب کشمیر' بوسنیا' الجزائر' مصر اور تاجکستان میں بنیادی حقوق کو پامال کرنے کا سبب بن رہا ہے تو دوسری جانب جارح اقوام کی پشت پناہی کر کے اپنے مفادات کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ تعصبانہ اور معاندانہ پہلو امریکی قیادت کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ ایک ارب ۲۰ کروڑ سے زائد مسلمان براہ راست امریکی عتاب کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ جائز مسائل سے چشم پوشی' تاخیری حربے اور انتقامی اقدامات امریکیوں کا وطیرہ بن چکے ہیں۔ ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک اور خاص طور پر اسلامی ممالک کو غلامی کے شکنجے میں پھانسنے کے لئے امریکی اقوام متحدہ اور اس کے ذیلی اداروں کو کھلے عام استعمال کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقوام متحدہ اب جو بھی منصوبہ بندی بناتا ہے اسے امریکی منصوبے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

کراچی کیا پاکستان کے جغرافیہ سے الگ ہے؟

وقائع نگار خصوصی

ملکی حالات پر اور خاص کر کراچی کی صورتحال پر اتنا کچھ کہا جا چکا ہے کہ اب کہنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ بے شمار قیمتی تجاویز اہل علم اور اہل درد نے پیش کیں مگر سب ردی کی ٹوکری میں ڈال دی گئیں' یا انہیں درخور اعتناء نہیں سمجھا گیا۔ اب واقعات کے حوالے سے ہی بات کی جا سکتی ہے جس جگہ کی بات میں کرنے چلا ہوں وہ پاکستان کا منفرد شہر ہے' جہاں انسانوں کا شکار دن رات کھیلا جا رہا ہے۔ اس کھیل کے پیچھے کون سے "جیالے" ہیں' آج تک ان کی نشاندہی نہیں ہوئی۔ کیا ان کے پاس "سلیمانی ٹوپی" ہے کہ روزانہ واردات کرتے ہیں اور بچ جاتے ہیں؟ شہر میں پولیس فورسیز موجود ہیں' چاق و چوبند فوجی دستے موجود ہیں مگر وہ سب بے بس ہیں۔ یہ سلیمانی ٹوپی کس نے مہیا کی ہے' اس پر بہت سی آراء اور بے شمار افواہیں شہر میں گشت کرتی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی اخبار میں اس کا کوئی گوشہ کسی حوالے سے آ جاتا ہے مگر تصدیق و تکذیب سے بے نیاز خبر گم ہو جاتی ہے۔

ذرا چشم تصور وا کیجئے' دولہا کے گھر باراتی بیٹھے ہیں' دولہا اپنی گاڑی سجانے کے لئے دوستوں کے ہمراہ گل فروش کے ہاں گیا ہے' تھوڑی دیر بعد خون میں لت پت اس کی لاش گھر پہنچتی ہے۔ خوشیوں کا گھر ماتم کدے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ باراتی کفن دفن کی تیاری کرنے لگتے ہیں۔ ماں باپ عزیز و اقارب کے ہوش گم ہیں۔ دلہن کو جب خبر ملتی ہے تو وہ اپنے حواس کھو بیٹھتی ہے۔ گھر والے اور اہل محلہ گواہی دیتے ہیں کہ اس لڑکے کی تو کسی سے دشمنی بھی نہ تھی۔ اس کا تعلق بھی کسی گروہ سے نہ تھا۔ ایسے واقعات دن رات ہو رہے ہیں' ہزاروں گھر ماتم کدہ بنے ہوئے ہیں۔ اس کا احساس اس شخص کو ہو سکتا ہے کہ جس کے ساتھ یا اس کے عزیز و اقارب کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آیا ہو' ورنہ یہ خبریں تو سبھی پڑھتے ہیں' کہیں سے درد و کرب کی آواز سننے میں نہیں آتی' اسلام آباد کی راتیں ویسے ہی رنگین ہیں' ڈنر اور لنچ اسی انداز پر چل رہے ہیں۔

اس شہر کراچی کو پاکستان کے جغرافیہ سے شاید الگ سمجھ لیا گیا ہے' بات سمجھ میں آتی ہے' اور آپ کی سمجھ میں بھی آ جائے گی جب آپ اس کا ایک اور پہلو دیکھیں گے۔ وزیراعظم صاحبہ سے جب کراچی میں اخبار نویسوں نے پوچھا کہ کراچی کی قتل و غارت گری پر آپ کا کیا ردعمل ہے تو جواب میں فرمایا گیا کہ اخبار والے بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ اگر وہ ان خبروں کو نمایاں نہ کریں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اب ساری ذمہ داری اخبارات پر آ گئی ہے۔ وہ قتل کی خبریں شائع کرتے قاتل کی فہرست میں آ گئے ہیں' وہ اگر خبریں شائع نہ کریں تو ہر طرف امن چین نظر آئے گا۔ اس سے زیادہ آسان حل اور کیا ہو سکتا ہے۔ وزیراعظم صاحبہ کو چاہئے کہ وہ صدر پاکستان کو ایسا مشورہ دیں کہ وہ ایک ایسا آرڈی نینس جاری کریں کہ جس سے اخبارات کی خبروں کی ناکہ بندی ہو جائے اس بے نیازی پر تو یہی کہا جا سکتا ہے ۔

تم کو آشفتہ نصیبوں کی خبر سے کیا کام
تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنے

وزیر اعلیٰ صاحب فرماتے ہیں کہ دہشت گردوں کے گرد گھیرا تنگ کر دیا ہے' یہ دو سال کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ گھیرا کس قدر تنگ ہوا ہے اور آئندہ کتنے برسوں میں مزید تنگ ہو گا یہ تو وقت ہی بتائے گا' ابھی تو شہریوں کا جینا تنگ ہو گیا ہے' جو خوف کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ رات کی نیندیں اڑ گئی ہیں' دن کا چین ختم ہو گیا ہے' ذہن پر ہر وقت انجانا خوف مسلط رہتا ہے۔

"کس کس کی بات کیجئے' کس کس کو روئیے!"۔

اخبار نویسوں نے جب انتظامیہ کے ایک اعلیٰ افسر سے دریافت کیا کہ شہر میں اجتماعی خانہ تلاشی دستور کی کس دفعہ کے تحت کی جاری ہے تو جواب ملا کر نظریہ ضرورت کے تحت ---- اس نظریہ ضرورت کو ذرا وسیع کر دیجئے' تو لوٹ مار بھی نظریہ ضرورت کا حصہ بن جائے گا۔ اغوا' قتل غارت گری کے مرتکب افراد اس نظریہ ضرورت کا سہارا لے سکتے ہیں' پولیس کی دھر پکڑ اور رشوت کی گرم بازاری تو نظریہ ضرورت کے تحت کبھی کی مستند ہو چکی ہے۔ ہر بے راہ روی کو نظریہ ضرورت کا سہارا مل جائے گا۔ ہونا یہ چاہئے کہ دستور کی ہر دفعہ معطل کر دی جائے اور ملک کو نظریہ ضرورت کے سپرد کر دیا جائے۔ جہاں تک اجتماعی تلاشی کا تعلق ہے تو یہ وہ واحد شہر ہے' یتیم شہر ہے کہ جس کے سر پر کوئی ہاتھ رکھنے والا نہیں ہے۔ پورے علاقے کو گھیرے میں لے لیا جاتا ہے اور حکم ہوتا ہے کہ دروازہ کھلا رکھو ہم آ رہے ہیں۔ گویا مکان کے اصل مالک کا داخلہ ہو گا۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ مکان اور اس کے مکین کون ہیں۔ اندھے کی لاٹھی ہر گھر میں گھومتی ہے۔ تمام سامان زلزلوں کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ تکیہ سے لے کر مسہری' الماریاں سب "اسقاط" کے عمل سے گزرتی ہیں۔ سوالات اس طرح کئے جاتے ہیں جس طرح قیامت کے دن ابن آدم کے قدم اپنی جگہ سے نہ اٹھ سکیں گے جب تک وہ پانچ باتوں کا جواب نہ دے دے۔ اللہ تعالیٰ تو عالم الغیب ہیں' وہ تو دلوں کے حال سے واقف ہیں۔ یہ نیا آنے والا تو چور' ڈاکو سمجھ کے آیا ہے' تخریب کار سمجھ کے آیا ہے اس کی گرفت الفاظ قرآنی کے مطابق' "اذابطشتم بطشتم جبارین" کی طرح ہوتی ہے۔ جب طوفان تھمتا ہے' مکین اپنے سامان سمیٹتے ہیں۔ انہیں کچھ چیزیں کم نظر آتی ہیں تو وہ اپنی جان کا صدقہ سمجھ کر صبر کر لیتے ہیں۔

چھوڑیئے ان باتوں کو جو لوگ اس عمل سے گزر رہے ہیں وہ جانیں اور ان کا خدا' ملک کے باقی لوگ تو خیریت سے ہیں۔ انہیں تو ہر طرح چین و آرام ہے۔ دستور کی دفعات کا اطلاق اس شہر پر نہیں ہوتا۔ یہاں کے شہری تو اس بات پر پریشان ہیں کہ اگر کوئی دوسرا ملک ان پر یلغار کرتا تو وہ جو ہاتھ میں میسر آتا رکھ کر اس سے مقابلہ کرتے' اپنوں کی یلغار کا مقابلہ کس طرح کیا جائے' تمہیں جتنا ستم کرنا آتا ہے ستم کر لو آخر تو تمہارے ہاتھ کبھی تھکیں گے۔ تمہارے اندر کا ضمیر اگر زندہ ہے تو کبھی وہ تم سے پوچھے گا۔ تم نے اپنے ضمیر کو جو خواب آور گولیاں کھلا رکھی ہیں' کبھی تو اس کا نشہ اترے گا وہ بیدار ہو گا۔OO

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

پریس ریلیز

چاہے پورا عالم اسلام مان لے' پاکستان اسرائیل کو تسلیم نہیں کرے گا

اولادِ آدم اور ذریتِ ابلیس میں کشاکش ازل سے جاری ہے' آج کل گھمسان کا رن پڑا ہوا ہے

مولانا صوفی محمد کو مشورہ دیا کہ نفاذِ شریعت کو علاقائی مسئلہ نہ بنائیں' میں انہیں پبلک پلیٹ فارم مہیا کردوں گا

لاہور' ۱۸ / نومبر۔ امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ چاہے سب عرب ممالک کیا پوری مسلم دنیا اسرائیل کو تسلیم کرلے' پاکستان تب بھی اسے تسلیم نہیں کرے گا اور ہم اس سلسلے میں رائے عامہ کو بیدار رکھیں گے تاکہ کسی کمزور لمحے میں ہماری حکومت کسی دباؤ کے سامنے جھک نہ جائے۔ مسجد دارالسلام باغ جناح میں اجتماع جمعہ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہمارے سرکاری موقف کے بیک وقت دو متضاد مظاہر سامنے آئے ہیں۔ اقوام متحدہ میں ہمارے نمائندے نے کہا ہے کہ پاکستان کسی صورت اسرائیل کو تسلیم نہیں کرے گا جبکہ اسلام آباد سے وزارت خارجہ کے ایک ترجمان کا کہنا ہے کہ اگر فرنٹ لائن عرب ریاستیں اسرائیل کو تسلیم کرلیں تو ہم بھی اس پر غور کریں گے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی مرض ایسا پیدا نہیں کیا جس کا علاج نہ نکالا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے دریافت کرنے میں ہمیں دیر لگ جائے۔ اسرائیل کی ناجائز و منحوس پیدائش سے ایک سال پہلے مشیت الٰہی نے پاکستان کی ولادت باسعادت کا انتظام کیا۔ چنانچہ عالم اسلام میں اس صیہونی ریاست کا توڑ صرف پاکستان ہے جو اسلام کے نام پر وجود میں آیا اور آئینی طور پر کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں قرارداد مقاصد کی شکل میں حاکمیت الٰہی کے اقرار اور عوام کے حق نیابت کو قرآن و سنت کی مقرر کردہ حدود کے اندر اندر استعمال کرنے کی پابندی کے باعث اصولی طور پر خلافت کا نظام طے شدہ ہے جسے عملاً نافذ کرنے کے لئے ایک انقلابی جدوجہد درکار ہے۔

ایک قومی اخبار میں شائع ہونے والے تحریک نفاذ شریعت کے سربراہ مولانا صوفی محمد کے انٹرویو کا حوالہ دیتے ہوئے امیر تنظیم اسلامی نے بتایا کہ دو سال قبل وہ ان سے خود جاکر ملے تھے اور ان سے درخواست کی تھی کہ نفاذ شریعت کو علاقائی مسئلہ نہ بنائیں بلکہ اس سوال کو قومی سطح پر اٹھائیں جس کے لئے لاہور میں وہ خود انہیں ایک پلیٹ فارم مہیا کرکے دے سکتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے انکشاف کیا کہ مولانا صوفی محمد کی اس پختہ رائے کو بھی انہوں نے بدلنے کی کوشش کی تھی کہ انتخابات میں حصہ لینا بلکہ ووٹ ڈالنا بھی حرام ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں خود انتخابی راستے کو پاکستان میں اسلام کے نفاذ کا ذریعہ نہیں مانتا' تاہم چونکہ ہمارا ملک آئینی طور پر ایک اسلامی ملک ہے لہٰذا ان لوگوں سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے جو نظام کی تبدیلی کے بغیر انتخابات کے ذریعے اسلام کا راستہ نکالنے کی امید رکھتے ہیں تاہم ان کے کام کو حرام کہنے کا کوئی جواز نہیں۔ اپنا تبصرہ جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ مولانا صوفی محمد خود بھی جماعت اسلامی کے رکن رہے ہیں اور اب اس جماعت پر ان کی شدید ترین الزام تراشی ہرگز کوئی پسندیدہ بات نہیں۔ جماعت کی قیادت پر جن لوگوں کا قبضہ ہوگیا ہے ان پر صوفی محمد صاحب کی فرد جرم صادق آسکتی ہے تاہم جماعت میں دین سے خلوص و اخلاص رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد آج بھی موجود ہے جو حصول اقتدار کی کشمکش' مال سمیٹنے اور دھوکہ دہی میں شریک نہیں بلکہ اپنے کام کو اقامت دین کی جدوجہد سمجھتی ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ صوفی محمد صاحب کی اس جراءت پر البتہ خراج تحسین پیش کیا جانا چاہئے کہ انہوں نے اپنے علاقے میں بیٹھ کر وہاں کے فساد میں اپنی جانوں سے ہاتھ دھونے والوں کو شہادت کا مرتبہ الاٹ نہیں کیا' بلکہ تسلیم کیا کہ یہ قربانیاں ضائع ہوئی ہیں۔

دنیا میں تیزی سے رونما ہونے والی تبدیلیوں اور اس خطے میں نیو ورلڈ آرڈر کی پیش قدمی کا پس منظر بیان کرتے ہوئے جس میں پاکستان واقع ہے' ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ یہ دراصل اولاد آدم اور ابلیس کی ذریت کے درمیان ازل سے جاری کشمکش کا نقطۂ عروج ہے۔ انہوں نے کہا کہ قرآن مجید میں آٹھ مقامات پر قصہ آدم و ابلیس کسی نہ کسی انداز میں دہرایا گیا ہے جس سے اس معرکے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے جو قیامت تک جاری رہنے والا ہے ان دنوں اس میں گھمسان کا رن پڑا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ زمانہ خیر و شر کی کشاکش میں تیزی و تندی کا دور ہے اور ہمیں یہ شعور بیدار کرنے کی ضرورت ہے کہ کٹھ پتلیوں کی ڈور کون ہلا رہا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اصل مقابلہ سوا ارب مسلمانوں اور زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ کروڑ یہودیوں کے درمیان ہے جو پروٹسٹنٹ عیسائیوں سے راستہ لے کر اب کیتھولکس میں بھی جا گھسے ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ عیسائی جو یہودیوں کا اصل دشمن ہے' صیہونیت کے ہاتھوں پوری طرح مفتوح ہو چکے ہیں۔ یہود نے دنیا کی مالیات پر قبضہ کرکے سود' کاغذی کرنسی اور مالیاتی اداروں کے ذریعے پہلے فرنگ کو اپنے شکنجے میں جکڑا اور علامہ اقبال خود دیکھ آئے تھے کہ فرنگ کی رگ جاں پنجہ یہود میں ہے اور اب وہ نیو ورلڈ آرڈر میں امریکہ کو واحد سپریم پاور بنا کر خود اس پر سوار ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ نیو ورلڈ آرڈر دنیائے عرب پر اپنا تسلط مکمل کرچکا ہے اور اسے کوئی خطرہ ہے تو وہ صرف دین اسلام سے یا پھر چین کی عسکری قوت سے ہے جبکہ بطور مذہب اسلام سے اس کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا بایں ہمہ اور بے روح ملائیت کے ساتھ بقائے باہمی میں اسے کوئی دشواری نہیں لیکن ایران جو اپنے انداز کی ایک اسلامی حکومت ہے اور پاکستان جو اسلام کے نام پر بنا اور نفاذ اسلام کے قوی امکانات رکھتا ہے اس کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے

(باقی صفحہ ۲۲)